نبضِ حیات

شفا گوالیاری

باہتمام حلقۂ دانشوران بھوپال

ناشر

سکریٹری مرکزِ ادب بھوپال

مولانا سید بصیر علی جعفری اکبرآبادی مرحوم
کے تعلیمی کارناموں کے نام

تصحیح

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۹	۹	[illegible]	ار
۳۸	[illegible]	تتا میں	نکلا میں
۳۹	۵	لیتا	لیا
۴۲	۱۰	جس میں	جب
۵۴	[illegible]	ہوئی	ہوئیں
۴۳	۳	ے	ے
۵۶	۲	مرحلہ	مرحلہ
۶۲	۲	ے	آئے
۶۲	۲	گا	گئے

٧٨٦

پیش لفظ

غزل شاعری کی ایک ایسی مقبول اور روح میں تیر جانیوالی صنف ہے جو شدید مخالفتوں کے باوجود زندہ ہے اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہمیشہ زندہ رہیگی۔ اس کی پائیدار زندگی اور دائمی مقبولیت کا سبب صرف یہی نہیں ہے کہ اس میں عشق و محبت کے ان جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے جو انسان کی فطرت بن چکے ہیں۔ یوں تو غزل کے لغوی معنی عشق بازی اور عورتوں سے بات چیت کرنے ہی کے ہیں، مگر غزل کو اُن لغوی معنی ہی میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل اس کے محدود نہ ہونے اور زندگی کے تمام مسائل پر بیکراں بنکر چھا جانے کی یہ صلاحیت ہی اسے دوام بخشنے کی ضامن ہے۔

غزل کی یہ عام مقبولیت زیادہ تر ان شعراء کی رہین منت ہے جو اپنے شعور کی گہرائی، احساس کی شدت اور موضوع کی صداقت، سادگی، اصلیت اور

جوش سے اس کو توانائی اور جوانی بلکہ دوشیزگی عطا کرتے رہے ہیں، ماضی قریب اور حال کے ایسے شعراء ہیں جنھوں نے غزل کی تمام بنیادی خصوصیات کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اسے زندگی کے بکھرے ہوئے وسیع موضوعات سے روشناس کرایا ہے اور اس کے پیکر میں بے پناہ وسعت پیدا کی ہے۔ فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، سیماب اکبرآبادی، حسرت موہانی، عزیز لکھنوی، جگر مرادآبادی اور فراق گورکھپوری کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان کے ہمہ گیر اور تڑپتے ہوئے شعور نے غزل کو عشق و محبت کے داخلی جذبات کی گہرائی سے ابھار کر آفاقیت کی وہ بلندیاں دی ہیں جو اس کی تاثرات کو وقت اور مقام کے قیود سے آزاد کرانے میں مدد دیتی ہیں۔ بعد کے نوجوان شعراء میں بہت بڑی تعداد ایسے ہوشمند لوگوں کی ہے جو عشق و محبت کو غزل کا بنیادی موضوع سمجھتے ہوئے بھی اسے صرف اسی موضوع میں بند کرنا نہیں چاہتے بلکہ زندگی کی دوسری حقیقتوں پر بھی نگاہ رکھتے ہیں۔ حیات انسانی میں بڑا تنوع ہے وہ ایک سمندر کی حیثیت رکھتی ہے جس میں ہر لمحہ نئی نئی لہریں اٹھتی ہیں جس کی سطح پر ان گنت حباب مچلتے ہیں، اور تہہ میں لاتعداد موتی جنم لیتے ہیں، اس میں ڈبو دینے کی قوت بھی ہے اور ابھار دینے کی صلاحیت بھی، اس میں موت کے بھنور بھی ناچتے ہیں اور زندگی کے مد و جزر بھی پیدا ہوتے ہیں، غزل بھی زندگی کی ان بیشمار کیفیات سے ہمکنار ہو کر نہایت وسیع، عمیق اور بیکراں بنجاتی ہے اس میں سماجی اور معاشی احساس کی دھڑکنیں بھی آجاتی ہیں، خوشی کے قہقہے بھی جذب ہوجاتے ہیں اور غم کے آنسو بھی۔ عمرانی نظریات سے لیکر تاریخی واقعات، تصوف، فلسفہ اور اخلاقی مسائل تک کے لئے گنجائش نکل آتی ہے۔ شفا گوالیاری کو میں اس دور کے ایسے ہی غزل گو شاعروں میں شمار کرتا ہوں جو غزل کے

مزاج میں ان تمام عناصر کی شمولیت ایک فطری توازن اور قدرتی تناسب کے ساتھ ضروری سمجھتے ہیں اور غزل کے موضوعات کو زندگی کے مانند وسیع اور ہمہ گیر خیال کرتے ہیں، اسی لئے وہ غزل کو حیات انسانی کی تمام ضروریات پر حاوی سمجھتے ہیں۔ اگرچہ شفا کا علمی پس منظر اور ذہنی پیش منظر بہت زیادہ وسیع نہیں ہے، ان کے مطالعہ میں بھی بھرپور گہرائی نظر نہیں آتی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بعض مقامات پر ان کے یہاں سطحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر بھی میں ان کی چند غزلیں دیکھ کر یہی اندازہ لگا سکا ہوں کہ وہ محض حسن و عشق کے موضوع میں بند نہیں اور ان کا شعور زندگی کی کھلی فضاؤں میں اُڑنے کی تڑپ اور امنگ رکھتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اسمیں وہ طاقت پرواز نہ ہو جو پوری کامیابی کے ساتھ ان پہنائیوں کو ناپ سکے۔

شفا زیادہ پرانے نہیں ہیں اور میں اُنھیں نئے شاعروں میں گنتا ہوں۔ لیکن ان کی ذہنی تربیت اس ماحول میں ہوئی ہے جہاں روایات کا احترام فرض تھا۔ چنانچہ اسی کا اثر ہے کہ غزل گوئی کے قدیم دستور کے مطابق وہ علامہ سیماب اکبرآبادی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے۔ اگر شفا کا بالکل ابتدائی کلام سامنے ہوتا تو آسانی سے اندازہ لگا کر کہا جا سکتا تھا کہ اس پرانی ڈگر پر چل کر ان کو کتنی فنی بلندیاں نصیب ہوئیں، تاہم یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ سیماب کی تربیت کے نقوش ان کے ذہن و دماغ پر بہت گہرے ہیں جو ہر جگہ زبان کی سلاست اور روانی نیز حسن بیان کے پردوں سے چھن کر قاری پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

شفا کے اشعار میں سوز و گداز کی جو کیفیت پائی جاتی ہے وہ فطرت کا ایک ایسا عطیہ ہے جس پر خارجی اثرات سے صرف جلا ہو سکتی ہے، اور اس کے

اظہار کا وہ سلیقہ مل سکتا ہے جو اس دبی دبائی چنگاری کو شعلہ کی لپک دے سکے، ورنہ جس طرح رگڑ سے دھات کا جوہر تبدیل نہیں ہوا کرتا، ان کی خلقت کا یہ سوز بھی کم و بیش نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے یہ ان کی ذاتی چیز کہی جا سکتی ہے۔ شفا فطری طور پر وہ صلاحیتیں رکھتے ہیں جو ایک غزل گو شاعر میں ہونی چاہئیں۔ ان میں ایک نوع کی عجیب سی گھبراہٹ ہے جو ان کی ہر ادا سے نمایاں ہے، پھر بھی "چلبلے پن" میں شامل نہیں ہو سکتی۔ اس گھبراہٹ کی تہ میں وہ تھرتھراہٹ محسوس ہوتی ہے جو گلاب کی پتیوں پر اٹکے ہوئے اس قطرۂ شبنم میں دیکھی جا سکتی ہے جسے اپنی فطرت گریاں کا احساس بھی ہوتا ہے اور ماہتاب کی گرمی کا بھی۔ یہ چیز ان کے احساس کی نزاکت اور شدت پر دلالت کرتی ہے اور احساس کی یہی نزاکت اور شدت انھیں وہ سب کچھ دے ڈالتی ہے جو غزل کے لئے نہایت ضروری ہے اور جس سے اشعار میں تاثیر پیدا ہوتی ہے، درد کی کسک آتی ہے، زندگی کی تحریک ملتی ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو کسی آرٹ کو حسین اور دلکش بنانے کے لئے کافی ہیں۔ شفا کے لہجہ اور پڑھنے کے انداز سے پتہ چلتا ہے کہ اگر انھیں دورِ حاضر کے سماجی اور معاشی مسائل کی تلخی سہارا نہ دیتی تو وہ صرف مرثیے کہتے، خود روتے اور دوسروں کو رلاتے اور اس طرح اپنے فطری سوز کی چنگاریوں کو اپنے ہی آنسوؤں سے بجھا لیتے۔ شفا عرصہ تک پرانی ڈگر پر چلتے رہے ہیں۔ اس وقت کے کلام میں تصوف کے روایتی مسائل ہیں اور اسی قسم کی اصطلاحات کا التزام ہے۔ تجنیس لفظی ہے اور الفاظ کے مناسب الفاظ لانے کی ایک مسلسل کوشش ہے۔ لیکن آگے چل کر ان کا موڈ بدلا اور اس کے تبدیل ہوتے ہی شعر کا مزاج بھی بدل گیا۔ وقت کے تقاضے ان کے کانوں میں گونجے اور زندگی کی ضروریات پر نگاہیں پڑیں اور اس وقت

اُنھوں نے حالی کی ہمنوائی میں غزل کو ایک بیکار صنف سمجھ کر یہ نہیں کہا:

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

اگر وہ ایسا کہتے تو یہ ان کے ذوق کی شکست اور فطرت کی ہار ہوتی، ان کے دل کی وہ آگ بجھ جاتی جس سے شاعر کے خیال اور تصور کو گرمی ملا کرتی ہے۔ انھوں نے زندگی کے سمندر میں اُٹھتی ہوئی ان لاتعداد موجوں کو دیکھا جو آگے پیچھے بھاگ رہی تھیں اور لگاتار ساحل سے ٹکرا رہی تھیں، ساتھ ہی ان مصائب اور مشکلات کو بھی محسوس کیا جو اِن موجوں پر بکھرے پڑے تھے، اُنھوں نے فوراً ہی اپنے احساس کو غالب کے احساس میں ڈبو کر یقین کر لیا۔

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

اسی وسعت کی تلاش میں وہ زندگی کے قریب آ گئے اس کے دل کی دھڑکنوں میں انھیں وقت کے نئے نئے تقاضوں کی گونج سنائی دی اور سماجی و معاشی مشکلات کی ایک لمبی فہرست نظر آئی، اس موڑ پر ان کا اسلوب بدل گیا۔ اور زندگی کا تنوع کا احساس داخلی اندازِ تخئیل میں گھل مل کر باہر آنے لگا۔ انھوں نے غزل کے نئے موضوعات اپنے گرد و پیش سے چن لئے اور انھیں اپنے احساس میں جذب کرنے کی مخلصانہ کوشش کی۔ داخلی اندازِ تخئیل اور جذبات کا سہارا لیکر شفا نے ان موضوعات کو اکثر اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

شفا کے احساس میں زندگی ہے اور وہ غمِ حیات اور غمِ جاناں کی فرق کو

سمجھتے ہیں اگرچہ حسن وعشق غزل کا بنیادی موضوع ہے، لیکن جو لوگ اس مادّی دنیا میں جی رہے ہیں، جہاں قدم قدم پر مصیبتیں ہیں اور ان کے ساتھ افلاس و غربت کی وہ مشکلات ہیں جو اعصاب سے عشق ومحبت کی ساری رنگینیاں نچوڑ لیتی ہیں اور رگوں میں دوڑتے ہوئے ولولوں کو منجمد کر دیتی ہیں اسی لئے وہ جانتے ہیں کہ غمِ حیات بہت بڑی چیز ہے۔ اس کا شعور بڑی بڑی شاہراہوں پر دوڑنے کا عزم جگاتا ہے اور درحقیقت غمِ زمانہ کی یہی گرمی ہے جو زندگی کے جمود کو توڑ کر اس میں تحریک اور جنبش پیدا کرتی ہے، یہی سیلابِ حیات کو آگے بڑھانے کی ذمہ دار ہے، اس کے برعکس محبت اور اُس کی رعنائیاں زندگی کے احساس کو جما دیتی ہیں اور انسان ان میں گم ہو کر اپنے اصل راستے سے بھٹک جاتا ہے،

غمِ دوراں نے بڑھ کر لو بڑھا دی شمعِ ہستی کی
غمِ جاناں کے یہ بھٹکے ہوئے جانے کہاں جاتے

زندگی پیہم عمل اور سرتاپا جدوجہد ہے، وہ ایک لگاتار دوڑ ہے جو کبھی تھمتی نہیں۔ اس دوڑ اور سعیٔ مسابقت میں وہی حصہ لے سکتے ہیں جو تھکنے اور رُکنے کے نام سے بھی واقف نہ ہوں اور اس مقصد کے لئے جان تک کی بھی پروانہ کریں۔

انھیں کو زندہ کہلانے کا حق ہوتا ہے دنیا میں
کہ جو مر کر بھی اپنی زندگی کی بات رکھتے ہیں

انسان زندگی کا مظہرِ اتم ہے، وہ ایک ایسا جوہر ہے جو اپنی ذاتی کوششوں کے سہارے ہی قائم ہے۔ وہ تیرگی میں روشنی بن کر چمکتا ہے۔ اور جب

کائنات پر اندھیروں کی چادریں تن جاتی ہیں تو وہی انھیں چاک کر کے سورج کی روشنی لاتا ہے۔ لیکن جب اس کے دل سے اس عظمت کا احساس فنا ہو جاتا ہے، خودی کی چنگاری بجھ جاتی ہے اور وہ عرض کی حیثیت میں آ کر سہارے ڈھونڈنے لگتا ہے تو اس کی ساری عظمتیں سرنگوں ہو جاتی ہیں یہی وقت ہوتا ہے جب شاعر کو اس کی رگِ حمیت میں نشتر چبھو کر اسے جگانے اور چونکانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ احساس کو جھنجوڑ کر اس میں خودی کا شعلہ فروزاں کر دے۔ شفا ایک ایسے ہی نازک مقام پر لطیف طنزیہ انداز میں اس سے سوال کرتے ہیں۔

کیا ہوئی تیری نگاہِ مہر ساز
کیوں افق سے مانگتا ہے تو سحر!

حیات کی سربلندیاں عزم و عمل کی ٹھوکروں سے سر ابھارتی ہیں، لیکن کتنے ہیں جو کامیابی کے اس راز سے واقف ہیں۔ جب عیش و کامرانی میسر ہوتی ہے تو اسے زمانہ کا فیض التفات سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ ہمارا اچھا وقت ہے اور جب اپنی ہی کوششوں کی کمی سے مصائب کا ہجوم ہوتا ہے تو اسے بُرے وقت سے تعبیر دی جاتی ہے۔ حالانکہ وقت نہ اچھا ہوتا ہے نہ بُرا۔ جو طاقت اسے اچھا یا بُرا بناتی ہے وہ ہے عزم و عمل یا بے عملی اور سہل انکاری۔

ہیں سب پرچھائیاں عزم و عمل کی
بگڑتا ہے نہ بنتا ہے زمانہ

بہت سی مشکلات ہیں جن کی جڑیں اس کھوکلے اور فرسودہ نظام میں

پیوست ہیں، لیکن اس بات کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جن کی نگاہیں معاشیات، اقتصادیات اور سیاست کی گہرائیوں تک پہنچ سکتی ہیں۔ موجودہ سماج میں بیشمار مصائبِ حیات اس طرح جنم لے رہے ہیں جیسے گندہ اور خراب نالیوں میں کیڑے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اگر سماج بدل جائے تو زندگی کی ساری بندھنیں ڈھیلی ہو جائیں۔ اور انسانیت آرام و راحت کے گہوارہ میں جھولنے لگے، لیکن جبتک ایسا نہیں ہوتا انسان کو وہ فضا میسر نہیں ہو سکتی جس میں اس کی انسانیت نکھر سکے، اور زندگی کو سہارے مل سکیں۔ شفا اسی خیال کے ماتحت اس نظام سے برہمی کا ہلکا سا اشارہ کرتے ہیں:۔

یونہی انسانیت گھٹتی رہیگی تنگ راہوں میں
بقدرِ زندگی جبتک نہ قدرِ زندگی ہوگی

انسان اپنی عظیم صلاحیتوں سے واقف نہیں ہوتا تو روشنی کی کرنیں اپنے وجود کے باہر ڈھونڈنے لگتا ہے اور زندگی کے تاریک راستوں میں اجالا پھیلانے کے لیئے چاند سورج سے تنویریں مانگنے لگتا ہے۔ شفا اس التجا کو توہین انسانیت سمجھتے ہیں۔ وہ انسان کے اندر ایک ایسی مستقل روشنی دیکھتے ہیں جو ہر اندھیرے کو روشن کر سکتی ہے:۔

چاند سورج کا نہ انساں ملتجی بن کر رہے
اپنی منزل میں خود اپنی روشنی بن کر رہے

جو لوگ اپنی عظمت کو نہیں سمجھتے ان کی دنیا میں صبح کی تخلیق چاند سورج پر ہی منحصر ہوتی ہے۔ انسان کی ذاتی کوششوں کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

زندگی میں ہر لمحہ مسابقت جاری رہتی ہے اور جب اس میں کوئی ہار جاتا ہے تو اس کا ولولۂ عمل ٹھنڈا نہیں ہوتا بلکہ اور بھڑک اٹھتا ہے، حوصلہ مند کبھی شکستوں سے ڈرا نہیں کرتے۔ ہار کا خطرہ انھیں کو ہوتا ہے جن کے دلوں میں زندگی، عزم اور حوصلہ کی آگ بجھ چکی ہے، زندہ اور عملی آدمی کے حوصلے شکست کی چوٹ کھا کر ہی بڑھتے ہیں، ہار سے ڈرنے والے فتح کی مسرت سے محروم رہجاتے ہیں۔

جہاں زندگی کو شکستوں کا ڈر ہے
وہیں زندگی کو سہارے ملیں گے

اس شعر میں زندگی کی تکرار سے کافی لطف پیدا ہو گیا ہے اور یقین کی قوت بڑھ گئی ہے۔

پہلے کہا جا چکا ہے کہ زندگی کے گوناگوں مسائل اور موضوعات کو پیش کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ شاعر انھیں اپنی زندگی اور مزاج کا حصہ بنالے اور قلبی واردات کی صورت میں اس طرح ان کا اظہار کرے کہ اس میں موسیقی کی لہریں بھی ہوں اور نغمگی کا حسین امتزاج بھی۔ شفا زندگی کے موضوعات کو اس طرح اپنانے اور بیان کرنے میں ابھی پوری طرح کامیاب نہیں ہیں۔ وہ ایک ہی موضوع کا مختلف اور متضاد حیثیت سے اظہار کرتے ہیں جو اس امر کا غماز بنجاتا ہے کہ وہ ان کے مزاج اور زندگی سے کوئی مضبوط اور گہرا رابطہ نہیں رکھتا، نہ ان کے شعور میں اس طرح گھُل مل گیا ہے کہ جب باہر آئے تو پوری یکسانیت کے ساتھ آئے۔ ایک جگہ وہ کہتے ہیں۔

آجتک ہم نے فروغِ دل پہ نظریں ہی نہ کیں
مہر و مہ پر منحصر اپنی سحر سمجھا کئے

فراق گورکھپوری کہتے ہیں کہ ادب اسی وقت زندہ رہ سکتا ہے اور ترقی کر سکتا ہے جب وہ جمہور کی ترقی میں مددگار ہو۔ ایمرسن کہتا ہے کہ ہر دور کو اپنا قومی ادب (Classes) پیدا کرنا چاہئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ادبی فن پارے میں عصری رجحانات کا ہونا ضروری ہے۔ شاعر اور ادیب کا سب سے بڑا ترقی پسندانہ اقدام یہی ہے کہ وہ اس راز کو سمجھ لے اور وقت کے تقاضوں سے چشم پوشی نہ کرے۔ موجودہ دور میں جب ہر طرف غمِ دوراں کی تاریکیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی ادیب یا شاعر عشق و محبت ہی کے جالوں میں الجھا رہے اور اس کے خیال میں اتنی تڑپ نہ ہو کہ وہ انھیں توڑ کر زندگی کے دوسرے مسائل کو چھو سکے تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ صرف ایک لاش ہے جس سے ماحول کو سڑاہند ہی مل سکتی ہے اور کوئی چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔ شاعر جب حسن و عشق کی کہکشاں بناتا تھا اور زندگی کے حقائق سے چشم پوشی کرتا تھا تو غمِ دوراں کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ لوگ سسکتے اور بلکتے رہتے تھے، خود شاعر مشکلات میں گھرا رہتا تھا، لیکن وہ غزل کے بنیادی موضوع سے ہٹنے کی جراءت نہ کرتا تھا۔ وہ شاعری جس میں غمِ عالم کی اہمیت نہ ہو شاعری نہیں وہم و خیال کی طلسم بندی ہے۔ شفا اس بات کو جانتے ہیں اور غمِ دوراں کو خوشی کا ایک پیام سمجھتے ہیں:-

اے غمِ عالم تری اس دلنوازی کے نثار — تیرے نزدیک آکے جیسے ہر خوشی تک آ گئے

زندگی اب وہ زندگی نہ رہی　　　موت آئے تو سوچ کر آئے

اور پھر فوراً ہی کہہ دیتے ہیں۔

اے شفا اپنی رات ہی اچھی　　　سحر آئے تو معتبر آئے

سحر کے مقابلہ میں رات کو ترجیح دینا، اور آنیوالی سحر کے متعلق "غیر معتبر" کے تذبذب میں مبتلا رہنا کھلی ہوئی رجعت پرستی اور ایک قسم کا فرار ہے اور شعور کے تھک جانے کی علامت ہے۔ یہ خیال اسی شخص کے ذہن میں آسکتا ہے جسمیں رات کو صبح کر لینے کا حوصلہ نہ ہو اور جو تشکیک کی وادیوں میں بھٹک رہا ہو۔ کہا جا سکتا ہے کہ غزل میں مسلسل اور منطقی ارتقا نہیں ہوتا۔ لیکن بقول ممتاز حسین ہر چند غزل کے اشعار منفرد تصورات کے حامل نہ ہوں لیکن غزل کی ہیئت جو آٹھ دس شعروں پر مشتمل ہوتی ہے وہ اپنا ایک مکمل وجود اور تعمیری احساس رکھتی ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی بھی نہ ہونی چاہئے جو بنیادی موڈ کے منافی ہو، ــــــــ

غزل کا ہر شعر ایک واحدہ اور ایک عالم اصغر سہی مگر شاعر کو ایک نظریہ کا پابند ضرور ہونا چاہئے اور ہر جگہ اس کی پابندی کرنی چاہئے۔ شفا کے یہاں ایسے اشعار دیکھ کر شبہہ ہوتا ہے کہ وہ نظریات کی اہمیت کو محسوس نہیں کرتے یا ان کی گہرائی اور عظمت تک نہیں پہنچتے اور محض تقلیدی طور پر ان سے متاثر ہو کر شعر کہہ دیتے ہیں۔ اسی لئے یہ تاثر تبدیل ہوتا رہتا ہے جو اس نظریہ کے اچھی طرح ہضم اور جذب نہ ہونے کا پتہ دیتا ہے۔ اس شبہہ سے ان کی شاعرانہ سطح کی بلندی کم ہو جاتی ہے اور ایک عامیانہ سطحیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ انھیں ہر موضوع کو اپنے شعور میں رچا لینا چاہئے اور مختلف نظریات حیات کو اچھی طرح ہضم کر لینا چاہئے۔

تاکہ جذبات کے سہارے داخلی اندازِ تخیّل سے وہ پوری قوت کے ساتھ اُنھیں بیان کرسکیں۔

غمِ زندگی کوئی طبعی کیفیت سے نہیں بلکہ ایک منفی چیز ہے۔ زندگی مسرور فضا چاہتی ہے، اسی میں وہ نپپ سکتی ہے اور وہی اس کا قدرتی حق ہے۔ اگر غمِ حیات کی فراوانی ہے تو یہ ایک غیر طبعی بات ہے جو ناقص نظامِ حیات کا نتیجہ کہی جاسکتی ہے۔ لیکن ان حالات میں غمِ حیات کا شعلہ رگِ عمل کو گرما کر انسان کو حالات کے بدلنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ اسی لئے غمِ حیات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ ایک جگہ شفا نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔

غمِ دوراں نے بڑھ کر لو بڑھا دی شمعِ ہستی کی
غمِ جاناں کے بھٹکے ہوئے جانے کہاں جاتے

مگر ایک اور مقام پر وہ ہر غم کو بغیر کسی قید اور شرط کے فطرت کا انعام کہکر زندگی کے لئے ایک مہمیز سے تعبیر کرتے ہیں

کوئی غم ہو شفا فطرت کا اک انعام ہوتا ہے
کہ اس سے زندگی کے سارے امکان جاگ اُٹھتے ہیں

ہر غم کو فطرت کا انعام کہنا مریضانہ تصور ہے جو اسی قسم کے تصوف کا دیا ہوا ہے۔ غم درحقیقت زندگی کا ایک فالج ہے جو اس کے اعصاب سے حس وحرکت کی صلاحیت چوس لیتا ہے۔ اسے فطرت کا انعام کہنا زندگی کے صحیح تصورات اور نظریات کی ایک باغیانہ نفی ہے۔

جہاں تک شعر کے اچھے اور بُرے ہونے کا سوال ہے آسانی سے

سمجھ میں آسکتا ہے کہ ہر غزل کا ہر شعر صنف غزل کے تقاضوں پر پورا نہیں اُتر سکتا۔ میر ایسے غزل گو کے یہاں بھی اچھے اور بُرے ہر قسم کے اشعار موجود ہیں، لیکن ان میں نظریاتی تضاد بالکل نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر ایک جگہ شاعر کسی نظریہ کو تسلیم کرتا ہے تو دوسری جگہ اس سے انکار کرنے کی فضا باقی نہیں رہتی، اس قسم کا تضاد نظریات اور موضوعات کو محض تقلیدی طور پر اپنانے کا نتیجہ ہوتا ہے جو صداقت اور خلوص کے منافی ہے۔ اسی تضاد کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔

غمِ جاناں سے ڈھلتا ہے غمِ دوراں کا آئینہ
یہ وہ قالب ہے جس سے قلبِ انساں جاگ اُٹھتے ہیں

اس شعر سے غمِ دوراں والے پہلے شعر کی پوری تکذیب ہو جاتی ہے اس کے علاوہ اس میں تجنیس لفظی کا ایک گورکھ دھندا بھی ہے۔ قالب اور قلب کے الفاظ کا یہ اجتماع آورد کی چٹان بنکر شعر پر گر پڑا ہے۔ جس طرح دنیا کا ہر ادیب اور شاعر حیات اور کائنات کے متعلق ایک مخصوص نظریہ رکھتا ہے جو زندگی کے تجربات کو سمجھنے میں اس کی مدد کرتا ہے۔ اسی طرح شفا کو بھی کسی ایک نظریہ کا حامی ہونا چاہیئے۔ قدم قدم پر نظریات کی تبدیلی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب تک وہ سماجی زندگی کے کسی ایسے موڑ پر نہیں پہنچ سکے جہاں سے انھیں کسی ایک طرف مڑ جانا چاہیئے۔

شفا کا تغزل کافی نکھرا ستھرا اور پاکیزہ ہے۔ یہاں تغزل سے مراد صرف حسن و عشق کے موضوع سے ہے۔ ورنہ حقیقی تغزل تو صرف وہی ہے جس میں داخلیت، تخئیل، جذبات، نغمگی اور غنائیت کا ایک خوبصورت امتزاج ہو ——

شفاحسن وعشق کی بات کرتے وقت بھٹکتے نہیں اور ان حدود میں داخل نہیں ہوتے جو متانت اور سنجیدگی کو پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔ سوقیانہ اور عامیانہ انداز بیان سے وہ بہت پرہیز کرتے ہیں۔ رندی اور سرمستی کے جذبات سے بھی گریز کی کوشش کرتے ہیں۔ تغزل ان کے یہاں ہے ضرور مگر اس حد تک نہیں ہے کہ زندگی کے دوسرے مسائل کا احساس باقی نہ رہے۔ وہ غزل میں مٹھاس اور ترنم پیدا کرنے کے لئے ہی عام طور پر اس کا استعمال کرتے ہیں۔ اس قسم کے چند اشعار دیکھئے۔

مہکے ہوئے لبوں پہ بہکا سایہ تبسم
پھولوں سے ڈھل رہا ہو جیسے شرابخانہ

ابتک نگاہ میں ہے پہلی نگاہ ان کی
ہنستی رہی محبت لٹتا رہا زمانہ

شب فراق کچھ ایسے بھی حادثے گذرے
چراغ جلتے رہے اور روشنی نہ رہی

شفا کا شاعرانہ وجدان متانت اور سنجیدگی سے رچا ہوا ہے، مگر ان کا سینہ کسی حد تک انقلاب اور بغاوت کی گرمی سے خالی معلوم ہوتا ہے۔ کسی جگہ بھی ان کے یہاں انقلاب کا دہکتا اور بھبکتا ہوا پیام نہیں ملتا۔ نظام سے بیزاری اور ہلکی سی برہمی ضرور مل جاتی ہے، لیکن اسے تبدیل کرنے کا مشورہ اوّل تو وہ بالکل ہی نہیں دیتے اور اگر بھولے سے یہ جرأت کرتے بھی ہیں تو اشاریت اور رمزیت کی آڑ لیکر۔ شفا بہت بیزار بھی ہوتے ہیں تو یہ کہہ کر

حالانکہ اس تلخیٔ گفتار کی مثالیں بھی ان کے کلام میں بہت کم ملتی ہیں۔ بعض جگہ بغاوت کا لفظ بھی ان کی زبان پر آجاتا ہے، مگر اس سے کوئی شعلہ نہیں چمکتا، کوئی چنگاری نہیں سلگتی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ یہ لفظ ہی استعمال کر سکتے ہیں، اس کا کوئی تصور یا پیام نہیں دیسکتے،

کیوں نہ ہر اک شاخ سے پھوٹی بغاوت کا لہو
گُل کا جذبہ تا کجا آخر کلی بن کر رہے

ایک اور جگہ وہ موت سے ٹھنڈی سی بغاوت کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔

توڑ کر ہم بیخودی کی حد خودی تک آگئے
موت سے کر کے بغاوت زندگی تک آگئے

شفا کی فطرت شاعرانہ سہی مگر عروض دانی اور بحر و قوافی کی زنجیریں اس شدت سے ان کے ذہن کو جکڑے ہوئے ہیں کہ بعض اوقات ان کی فکری آزادیاں پابندیوں میں گھر جاتی ہیں، خاص طور پر اس وقت جب وہ پچاس سال پہلے والے انداز میں اس قسم کا کوئی دعویٰ کرتے ہیں

بحر کوئی سی ہو پانی کر دکھائیں
ہم شفا واقف ہیں فن شاعری سے

فن شاعری کا وقوف کتنا ہی قابلِ فخر کیوں نہ ہو، یہ التزام خیال کی روانی اور تصور کی بلندی میں رکاوٹ بنجاتا ہے۔ شاعری صرف فن نہیں وہ کچھ اور بھی ہے۔ خیال اور شعور کی پیروی میں جب فن کی بیڑیاں پڑ جاتی ہیں تو انکی روانی اور بلند پروازی فنا ہو جاتی ہے۔ پھر الفاظ کا یہ التزام کہ ایک جگہ اگر

چُپ ہو جاتے ہیں۔

متحد رہتے اگر گلشن میں خار و گل شفا
اور ہی کچھ آج تنظیم گلستاں دیکھتے

خار و گل کے انتشار اور عداوت کے جو اسباب پردۂ زنگاری میں چھپے ہوئے معشوق کی حیثیت سے کام کر رہے تھے ان پر شفا کی نظر نہیں پڑتی شاید وہ انھیں دیکھنا بھی نہیں چاہتے۔ اور خار و گل پر انتشار کا الزام لگاتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ اگر ان کے شعور میں برہمی کی آگ ہوتی اور اس انتشار سے انکے جذبات پر کوئی شدید ضرب پڑتی تو وہ ان عوامل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتے جو خار و گل کو جدا کرنے کا باعث ہوئے، پھر یقیناً وہ ان جغرافیائی حدود سے گہری نفرت کا اظہار کرتے جو "خار و گل" کے درمیان حائل ہیں بشرطیکہ ان لائنوں کے اِدھر اور اُدھر بسنے والوں کو اس نام سے پکارا جا سکے۔ لیکن ان کے شعور میں زیادہ گرمی نہیں ہے۔ وہ کسی بڑے دریا سے کاٹی ہوئی نہر کے مانند آہستگی اور خاموشی سے بہنا جانتے ہیں۔ پہاڑی آبشار کی سی بےچینی اور اضطراب ان کے ذہن میں نہیں ہے جو بپھرتا، شور مچاتا اور چٹانوں سے ٹکراتا نہایت تیزی اور شوریدگی کے ساتھ بہتا ہے۔ وہ خوش بیانی کو تلخ گفتاری میں تبدیل کر دینے کا نام ہی عزم باغیانہ رکھ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انکے یہاں قلب و دماغ کی گرمیاں اعتدال کی صورت میں ڈھل گئی ہیں۔ وہ بہت زیادہ گرم ہو کر بھی یہی کہہ سکتے ہیں۔

سینۂ گل سے لبِ خار تک آ پہنچے ہیں
خوش بیانی تلخیٔ گفتار تک آ پہنچے ہیں

بحر کہدیا ہے تو اس کی مناسبت سے پانی ضرور کہنا چاہیئے، شعر کی معنویت کے ساتھ شدید ظلم ہے

مجموعی حیثیت سے شفا ایک اچھے غزل گو ہیں۔ اور ان کی غزل یقیناً ان اوصاف اور خصوصیات کی امین ہے جن کو جدا کر دینے کے بعد تغزّل کا کوئی تصور باقی نہیں رہتا۔ "نبضِ حیات" ان کا دوسرا مجموعہ کلام ہے اس سے پہلے ان کا ایک اور مجموعہ "آیاتِ شفا" کے نام سے چھپ چکا ہے جس پر ملک کے مشہور نقادوں نے بہت اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ "نبض حیات" میں غزلیات کے علاوہ چند رباعیات بھی ہیں۔ شفا کو رباعی کہنے کا بڑا اچھا ملکہ حاصل ہے۔ مگر مجھے ان کی رباعیات میں جو بات کھٹکتی ہے وہ الفاظ کا التزام ہے، جسے میں آورد کے علاوہ کچھ اور نہیں کہہ سکتا۔

کرنا ہے جو تجھ کو تو بیاں بھی کر دے
ہاں جذبۂ پنہاں کو عیاں بھی کر دے
او زیست کے ہجے میں اٹکنے والے
اٹھ زیست کے ہجے کو رواں بھی کر دے

ان کی رباعیوں کا مزاج یقیناً گرمی کی طرف مائل ہے مگر اتنا نہیں کہ خون کو کھولا دے۔ کہیں کہیں وہ معاشی نظام کی خرابیوں تک بھی پہنچے ہیں ایک مقام پر بغاوت کا راز فاش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

جبرِ غمِ ایام سے گھبراتے ہیں ۔۔۔ طوفانِ مصائب سی بپھر جاتے ہیں
جب ہوجاتا ہے پانی سر سے اونچا ۔۔۔ انسان بغاوت پہ اتر آتے ہیں

انقلاب کی تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی اس کا جوالا مکھی پھٹتا ہے اس کی تہہ میں معاشی بحران، بدحالی، مفلسی اور حد سے زیادہ دباؤ کی چنگاریاں ہی سلگتی دیکھی گئی ہیں۔

شفا معاشی بحران کی شدت کا اعتراف بھی کرتے ہیں جو ان کے شاعرانہ خلوص کی علامت ہے

افلاس کا ہر سمت اُٹھا ہے طوفان
سینوں میں بھنور دل میں بپا ہے ہیجان
انسان کو انسان نہ کھائے کب تک
ہے نقطۂ آخر پہ معاشی بحران

مجھے پوری امید ہے کہ شفا کا دوسرا مجموعہ ارباب ذوق کو پسند آئے گا۔ اور وہ شفا کی ذہنی و دماغی کاوش اور ان کے شاعرانہ خلوص کا اعتراف کرینگے۔

کوثر چاند پوری۔ بھوپال
مئی ۱۹۵۵ء

غزلیں

مبارکباد اُن کی عزم کو، ان پر سلام اپنا
کہ جو سولی پہ چڑھ کر بھی سناتی ہیں پیام اپنا

گھِسا ہر در پہ سر تو نے نہ پہچانا مقام اپنا
ارے بدبخت کرتا سب سے پہلے احترام اپنا

بھروسا مشعلوں پر تا بکجا اے کارواں والو
خود اپنی روشنی میں کیوں نہ پہچانو مقام اپنا

یہ باقی زندگی بھی سہو کی سجدوں میں کھو دوگے
کوئی حاضر دماغ اب بھی بنا لو تم امام اپنا

جو منزل پر بھی یہ کہہ دے کہ منزل دور ہی تیری
بس ایسے رہنما کو دور ہی سے ہے سلام اپنا

فقط نازک سا پردہ جنبش و لغزش کا ہے ورنہ
نظامِ زندگی کیا، زندگی خود ہے نظام اپنا

جہاں سے تو ذرا پہچان لے اپنی حقیقت کو
وہیں سے فرض ہو جاتا ہے تجھ پر احترام اپنا

بقا کے واسطے آخر فنا کی منتیں کب تک
بنائے اپنے بل پر زندگی کوئی نظام اپنا

اب آئینگے نہ اے ساقی ترے رنگیں فریبوں میں
ہمارے ہاتھ میں آجائے جب سمجھیں گے جام اپنا

اُجالوں کو نکھاریگی شفقؔ تاریکیاں کب تک
دکھائے گی کہاں تک صبح کو آئینہ شام اپنا

مرے ذوقِ تجسّس کی وہ منزل کونسی ہوگی
نظر جب اُن کو پا کر بھی انھیں کو ڈھونڈھتی ہوگی

ہماری ہجرتِ گلشن بعنوانِ جلی ہوگی
نشیمن سے قفس تک روشنی ہی روشنی ہوگی

یونہی انسانیت گھُٹتی رہیگی تنگ راہوں میں
بقدرِ زندگی جب تک نہ قدرِ زندگی ہوگی

جو رازِ بزم کو آئینہ کردے گی بیک جنبش
اِک ایسی بھی نظر اُن کی نظر کو دیکھتی ہوگی

خرد یہ مسکرا کر سوچتی ہوگی "کہ دیکھیں گے
کہاں تک پردہ دارِ زندگی، دیوانگی ہوگی

ہمارا پوچھنا کیا ہم وہ جاں بازِ محبت ہیں
ہماری موت میں بھی اِک ادائے زندگی ہوگی

نہ دامن کش کوئی نکلا شفاؔ اپنا گلستاں میں
گلوں کے سائے میں خاروں کو بھی نیند آگئی ہوگی

اِک نظر ہاں صرف اک کاری نظر
پتھروں کا پھونک دیتی ہے جگر

ہائے یہ آثارِ انجامِ سفر
رات کی آنکھوں میں ہیں اشکِ سحر

کیا ہوئی تیری نگاہِ مہر ساز
کیوں افق سے مانگتا ہے تو سحر

تا بکے رنگِ تجاہل یہ ترا
تا کجا عذرِ حیاتِ مختصر

عزمِ دل کی لَو بڑھائے تو کوئی
رہگذر خود ہے چراغِ رہگذر

رُک نہیں سکتے قدم اٹھے ہوئے
مسکرائیں لاکھ اب شام و سحر

عالمِ خود آگہی تو دیکھئے
اپنا اپنا در ہے ۔ اپنا اپنا سر

رُک گئیں کیوں گردشیں کونین کی
چلدیا یہ کون نظریں پھیر کر

اے شفاؔ کیا کر رہے ہو یہ غضب
زندگی سے اور اتنے بے خبر!

خرد کی راہ سے دیوانگی تک بات کیوں پہنچے
شعورِ غم کی آشفتہ سری تک بات کیوں پہنچے

وقارِ عشق کی غم یا خوشی تک بات کیوں پہنچے
ہزاروں اور بھی دل ہیں اسی تک بات کیوں پہنچے

اگر دامن بچے رہبر کی الجھن سے تو اچھا ہے
خرابِ جستجو کی گم رہی تک بات کیوں پہنچے

نگاہ و دل کو پرتو سے کریں شام و سحر روشن
مہ و خورشید کی تابندگی تک بات کیوں پہنچے

محبّت کی کہانی ہو کہ نفرت کی حکایت ہو
کسی کی بھی سہی لیکن کسی تک بات کیوں پہنچے

نکھرتا ہے تو نکھرے اپنے ہی آئینے میں فطرت
کسی رُخ سے نگاہِ آدمی تک بات کیوں پہنچے

محبّت خود ہی حل کر لے محبّت کے معموں کو
الجھنے کو خودی و بیخودی تک بات کیوں پہنچے

سمو دیں حال کے دل میں جو مستقبل کی دھڑکن کو
تو بڑھ کر اس صدی سے اُس صدی تک بات کیوں پہنچے

سکوتِ گُل ہی آئینہ بنا دے رازِ گلشن کو
شفاؔ اپنے مذاقِ شاعری تک بات کیوں پہنچے

عیاں تاروں پہ رازِ دیدۂ گریاں نہ ہو جائے
بھری محفل میں توہینِ شبِ ہجراں نہ ہو جائے

معمہ بن کے رہ جاؤں نہ اُنکی کم نگاہی سے
مجھ ہی میں خود مری ہستی کہیں پنہاں نہ ہو جائے

ابھی بیگانۂ انجام، نو آموزِ فطرت ہے
کہیں شبنم کے اشکوں پر کلی خنداں نہ ہو جائے

غمِ دل پر نہ پڑ جائے نگاہِ التفات اُن کی
یہ افسانہ سمٹ کر پھر کہیں عنواں نہ ہو جائے

شعورِ تنگ بیں کو مائلِ پرواز رہنے دے
تجھے محسوس جبتک رفعتِ انساں نہ ہو جائے

معاذ اللہ یوں ساحل پہ آنا ڈوب جانا ہے
شفا جب تک ہمیں اندازۂ طوفاں نہ ہو جائے

جو مرحلۂ سخت کا حامل نہیں ہوتا
وہ زندگی بھر فائزِ منزل نہیں ہوتا؟

مجبور پہ، مایوس پہ یہ جورِ مسلسل
مجبور کے، مایوس کے کیا دل نہیں ہوتا؟

اشکوں پہ ہے بے جوڑ سا یہ عکسِ تبسّم
آئینے کے آئینہ مقابل نہیں ہوتا!

کیوں زندگی بیگانہ ہوئی جاتی ہے مجھ سے
اب درد سے شاید ادب دل نہیں ہوتا

نادان، تو خود اپنی جگہ آپ ہی منزل
کیوں کہتا ہے میں واصلِ منزل نہیں ہوتا

ترتیب دیا جاتا ہے یہ عزم رواں سے
طوفان ہیں پنہاں کبھی ساحل نہیں ہوتا

پروانے شفا اس لئے کھا جاتے ہیں دھوکا
نظروں میں مآلِ شبِ محفل نہیں ہوتا

وہ پہلے سوچ لیں کھلتی ہوئی کلی کیا ہے
جو سوچتے ہیں کہ ترکیب زندگی کیا ہے

کدھر ہے غیرتِ غم کچھ مجھے سہارا دے
وہ مجھ سے پوچھ رہی ہیں "تری خوشی کیا ہے"

وفا کا راز نہ سمجھا سکا کوئی اب تک
کہ اس کی کیا ہے حقیقت، یہ واقعی کیا ہے؟

یہی تو ہوتی ہے سارے زخموں کا آئینہ
کوئی سمجھ کے تو دیکھے کہ بے رُخی کیا ہے

دمِ اخیر ہے کس کا خیال جلوہ فروز
یہ میری موت کی حد میں حیات سی کیا ہے!؟

دراز عمر ہوائے جینے والے تیری مگر
جو صرف اپنے لئے ہو وہ زندگی کیا ہے

نہ جانے کیا ہو کہ میری ہی روشنی ہے شفا
خودی یہ سوچ رہی ہے کہ بیخودی کیا ہے!؟

بہ جذبِ دل، بہ نازِ آگہانہ   جبیں ہے بے نیازِ آستانہ
سلامت اپنا سوزِ باغیانہ   بنے گا بجلیوں میں آشیانہ
جھکیں گے چاند سورج میرے آگے   اُٹھیگی جب نگاہ غازیانہ
چمن ہی کے بدل دیں کیوں نہ دستور   قفس کو کیا بنائیں آشیانہ
ہیں سب پرچھائیاں عزم و عمل کی   بگڑتا ہے نہ بنتا ہے زمانہ
خودی و بیخودی دونوں ہیں دھوکے   نہ ہو جب تک نگاہِ عارفانہ
حقیقت کو زیادہ چھاننے سے   حقیقت بھی نہ بن جائے فسانہ
زمیں کو ہم ملا دیں گے فلک سے   جب اُٹھیں گے بزعمِ شاعرانہ

پرکھ لیتا ہوں ہر اچھے بُرے کو
شفا نظریں ہیں میری ناقدانہ

چمن بدوش ہوئے جارہے ہیں ویرانے
یہ نقش کون سے اُبھرے ہیں تیرے دیوانے؟!

ہیں عکسِ عینِ حقیقت دلوں کے کاشانے
غبار سے نہ چھُپیں گے یہ آئینہ خانے

ہمارا عالمِ بیگانگی خدا کی پناہ
کہ روشنی میں بھی اپنی نہ خود کو پہچانے

اب اور کون سے گُل رہ گئے ہیں کھِلنے کو
الٰہی خیر ہو کیوں مُسکرائے دیوانے

زہے تصرّفِ برہم نگاہیِ ساقی
کہ چشمِ یاس سے ڈھل ڈھل کے آئے پیمانے

خودیِ حُسن بھی تھی، بیخودیِ عشق بھی تھی
کہ عُمر بھر وہ ہمیں ۔ ہم اُنھیں نہ پہچانے

پیا کرے گا بقدرِ ظرف ہر میکش
ہٹائے جائینگے اب میکدوں سے پیمانے

یہ احترامِ تجلّی بقیدِ خودداری
نگاہِ شمع سے گِر کر اُٹھے نہ پروانے

جو کھو کے رہ گئے عنوان کو اندھیروں میں
مری نگاہ میں ایسے بھی ہیں کچھ افسانے

پہنچ سکے نہ شفاؔ سرحدِ حقیقت تک
فریب اتنے دیئے اعتبارِ دُنیا نے

زمیں سے گزرے ہیں یا آسماں سے گزرے ہیں
جہاں کو ساتھ لیا ہے جہاں سے گزرے ہیں

ہوا چمن میں پھر اعلانِ آشیاں بندی
ابھی کی بات ہے اک امتحاں سے گزرے ہیں

بہ جوشِ سعئ بغاوت زمیں کے یہ ذرّے
ہزاروں بار سرِ آسماں سے گزرے ہیں

وہیں الجھ سے گئے ہیں، وہیں ٹھٹک سے گئے
نگاہیں اپنی بچا کر جہاں سے گزرے ہیں

نہ پوچھئے کششِ منزلِ غمِ جاناں
یہیں کے ہو گئے جو بھی یہاں سے گزرے ہیں

قدم قدم میں ہمارے ہے جذبۂ تخلیق
وہیں اُبھار دی منزل جہاں سے گزرے ہیں

شفاؔ بڑھو کہ اُفق در نظر، رجز بر لب
شفق کی آڑ میں کچھ کارواں سے گزرے ہیں

خوشی کے بھی غم میں نشاں دیکھتا ہوں — اندھیرے میں پر چھائیاں دیکھتا ہوں
وہیں اُن کو میں بے نکاں دیکھتا ہوں — بغیر آنکھ اُٹھائے جہاں دیکھتا ہوں
نگاہِ تجسس سے ہوتا ہوں نادم — میں جب خود میں اُنکو نہاں دیکھتا ہوں
ادب کر مذاقِ نظارہ ادب کر — نظر کو بھی کیوں درمیاں دیکھتا ہوں
جبیں کی طرف آستاں بڑھ رہا ہے — یہ میں آج خود کو کہاں دیکھتا ہوں
وہ جب دیکھتے ہیں کبھی میری جانب — تو میں جانب آسماں دیکھتا ہوں
جو اپنی جگہہ خود قفس بن گئے ہیں — کچھ ایسے بھی میں آشیاں دیکھتا ہوں
بہت رہبر و رہنما آئے لیکن — جہاں تھا وہیں کارواں دیکھتا ہوں

نتیجہ بھی جس کا شفاؔ امتحاں ہے
عجب آج کا امتحاں دیکھتا ہوں

ابھی اِک آس ہے ساقی کہ دورِ جام آتا ہے
اُلٹ دیں میکدہ رندوں کو یہ بھی کام آتا ہے

کچھ اِس ترکیب سے اب آشیانے باد ہوتے ہیں
کہ بربادی کا خود اپنے ہی سر الزام آتا ہے

یہ کیا بدنظمیاں ہیں تیرے میخانے میں اے ساقی
کسی کے نام کا ساغر کسی کے نام آتا ہے

مرے اشکوں سے نسبت کیا تبسم کو ترے لیکن
شگفتِ گل کا کچھ شبنم پہ بھی الزام آتا ہے

کہاں کی یاد کس کا ذکر ان کی بزمِ رنگیں میں
ہمارا نام بھی اب تو برائے نام آتا ہے

خدا شاہد کہ دل سے تو خدا کا نام لیتا ہوں
مگر لب پر جب آتا ہے تمہارا نام آتا ہے

ادب سے عرشِ اعظم بھی جھکا دیتا ہے سر اپنا
حریم قدس میں انساں کا جب نام آتا ہے

شفاؔ یہ انقلاب اک امتحاں ہے اہلِ اُلفت کا
ہمیں یہ دیکھنا ہے کون کس کے کام آتا ہے

صورت کسی کی دیکھنی قسمت میں تھی کہاں
ٹوٹا ہے میرا آئینۂ زندگی کہاں!

روشن حیات ہو گی نہ جانے مری کہاں
غم بخشتی ہے دیکھئے چل کر خوشی کہاں؟

ہر ایک سانس ہے جہاں توہینِ زندگی
یہ لے کر آگئی ہے مجھے زندگی کہاں؟!

شاید فریبِ ساحلِ دُنیا میں آگئی
یہ کشتیٔ حیات مری رُک گئی کہاں!

کلیاں سسک کے رہ گئیں، گُل کُسمسا گئے
تم نے بھی آکے روکی ہو اپنی ہنسی کہاں!

اے بیکسیٔ عشق ذرا بڑھ کے دیکھنا
آگے یہ مجھ سے زندگی میری چلی کہاں؟

رُکتی ہے دیکھو گردشِ عالم کدھر شفا
لیتی ہے سانس اب یہ مری زندگی کہاں؟

محوِ خوابِ حال ہیں، تعبیرِ مستقبل سے دور
خُفتہ ذہنی نے کیا ہے کس قدر حاصل سے دور

کچھ خبر بھی ہے تجھے او گوشہ گیر و معتکف
راہرو کتنے بھٹک کر ہو گئے منزل سے دور

اصل میں تو اپنے دل ہی سے نہیں ہے باخبر
ورنہ اے ناداں نہیں ہے کوئی بھی شے دل سے دور

نیتِ صادق سلامت، جذبۂ کامل بخیر
دور ہے کب تم سے منزل، کب ہو تم منزل سے دور

زندگی ہے اک مسلسل سوز، پیہم اضطراب
سعئ حاصل سے قریب، اور سعئ لاحاصل سے دور

دل میں ہے عزمِ مسلسل، عزم میں پیہم تڑپ
ہیں وہی کچھ پاس منزل کے، جو ہیں منزل سے دور

اے شفا آسانیاں ملنا کوئی آساں نہیں
مُشکل آتی ہے تو ہوتی ہے بڑی مشکل سے دور

ہوش میں آ زندگی تو نے غلط سمجھا نہ مجھے
دے نہیں سکتی کسی منزل پہ بھی دھوکا مجھے

میرے افسانے کو پھر عنوان میں اُلجھا دیا
آپ نے اپنی طرف کیوں دیکھ کر دیکھا نہ مجھے

اور تو ہر طرح تکمیلِ پرستش ہو چکی
صرف اپنے سامنے کرنا ہے اک سجدا نہ مجھے

زندگی کی اُلجھنیں اب بھی سلجھ جائیں تمام
اک ذرا امیرِ نفس گر چھوڑ دے تنہا نہ مجھے

یاد آجاتی ہے اپنے وقت کی بے اختیار
جب نظر آتا ہے کوئی وقت کا مارا مجھے

ڈوب مرا اے زندگی، یہ کیا ترے ہوتے ہوئے
موت آئی ہے بتانے کے لئے رستا نہ مجھے

عُمرِ رفتہ، ہے یہ ناممکن تجھے آواز دوں
آج تک تو نے پلٹ کر بھی کبھی دیکھا مجھے

وقت کے ہمراہ میں دُنیا سے آگے بڑھ گیا
اے شفاؔ آواز دیتی رہ گئی دنیا مجھے

کن نگاہوں سے بھلا جشنِ بہاراں دیکھتے
اپنے ہی دل کے لہو سے کیا چراغاں دیکھتے

جان میں گر جان ہوتی تو یہ امکاں دیکھتے
کس طرح ہم ان کو نزدیکِ رگِ جاں دیکھتے

آج کیوں اپنی غلط بینی پہ روتے، ہم اگر
آدمی کو آدمی، انساں کو انساں دیکھتے

ہم نے آزادی کو خود نذرِ اسیری کر دیا
گلستاں پر تا کجا جورِ نمایاں دیکھتے

نظمِ فطرت کا بھرم رکھنا تھا ہم کو، ورنہ ہم
لوٹ کر کب تجھ کو اے عمرِ گریزاں دیکھتے

زندگی پھر موت، بعد الموت، قبلِ زندگی
عمر گزری ہے یہی خوابِ پریشاں دیکھتے

متحد رہتے اگر گلشن میں خار و گل شفاؔ
اور ہی کچھ آج تنظیمِ گلستاں دیکھتے

ذوقِ سجدہ ایک نقشِ کامراں بنتا گیا
آستاں پر اُنکے میرا آستاں بنتا گیا
بے نشانی کے سہارے پر نشاں بنتا گیا
ضامنِ منزل غبارِ کارواں بنتا گیا
قدرتاً بربادیوں کی داستاں بنتا گیا
خود بخود بجلی کی زد میں آشیاں بنتا گیا
کیا خطا صیاد کی اور باغباں کا کیا قصور
گلستاں میں خود تو ننگِ گلستاں بنتا گیا
وائے محرومیٔ الفت، اُن کا غم بھی تو ندیم
بدنصیبی سے نصیبِ دشمناں بنتا گیا
مجھ سے کیا کہتے ہو اب، دنیا جو کہتی ہے کہے
تم کرم کرتے گئے میں داستاں بنتا گیا
حاملِ تعمیر تھی تخریب پیہم اے شفا
آشیاں مٹ مٹ کے نقشِ آشیاں بنتا گیا

ہزاروں غم ہوں لیکن ہم خوشی کی بات رکھتے ہیں
خزاں میں بھی بہارِ زندگی کی بات رکھتے ہیں

بہر صورت وہ اپنی کجروی کی بات رکھتے ہیں
جو اپنی کھو چکے ہوں کب کسی کی بات رکھتے ہیں

ہماری بیخودی کو مسکرا کر دیکھنے والے
خدا شاہد کہ ہم تیری خودی کی بات رکھتے ہیں

اُنہیں کو زندہ کہلانے کا حق ہوتا ہے دنیا میں
کہ جو مر کر بھی اپنی زندگی کی بات رکھتے ہیں

نہ توڑی ہے کبھی دست و گریباں کی حدِ فاصل
بقدارِ خرد دیوانگی کی بات رکھتے ہیں

ہمیں احساس ہے گمراہیوں کا اپنی اے رہبر
مگر تیرے فریبِ رہبری کی بات رکھتے ہیں

توجہ ہی نہیں کرتے ہیں نادانوں کی باتوں پر
جو دانشور ہیں وہ دانشوری کی بات رکھتے ہیں

خرد کو سامنے رکھ کر جنوں کا امتحاں کر لوں
جو تم کہدو تو اک سجدہ بغیر آستاں کر لوں

بہار آنے کو ہے اک اور سعیٔ رائیگاں کر لوں
منتظم منتشر ہونے کو لاؤ داستاں کر لوں

وہ جتنی دیر میں سجدہ نوازی میری فرمائیں
تجھی کو اے جبین شوق جب تک آستاں کر لوں

بعنوانِ محبت جب سراپا داستاں ہوں میں
بایں تکمیل پھر کس کی مکمل داستاں کر لوں؟

حقیقت میں یہی آئینہ دارِ نقش منزل ہے
غبارِ کارواں کو بھی شریکِ کارواں کر لوں

فریبِ حسن دیتے ہیں تو اتنا معتبر دیدیں
یقیں کی منزلوں تک خود کا اُن پر میں گماں کر لوں

جو آزادی شفاؔ معناً عبارت ہے اسیری سے
تو مفہوماً قفس ہی کو تصور آشیاں کر لوں

حدِ عنواں سے آگے آخر افسانے کہاں جاتے
تری محفل سے بڑھ کر تیرے دیوانے کہاں جاتے
حقیقت سے گزر کر آئینہ خانے کہاں جاتے
اگر ہم تک نہیں آتے تو پیمانے کہاں جاتے
غمِ دوراں نے بڑھ کر لو بڑھا دی شمعِ ہستی کی
غمِ جاناں کے یہ بھٹکے ہوئے جانے کہاں جاتے
نگاہیں تھیں ہماری فرقِ خاص و عام سے آگے
اگر وہ آ بھی جاتے ہم سے پہچانے کہاں جاتے
یہ رندوں کی ہے شانِ بے نیازی ساقیو، ورنہ
نہ جانے تم کہاں ہوتے یہ میخانے کہاں جاتے
بھرم اشکِ الم کا رکھ لیا ذروں کے سینوں نے
ستاروں کی جبینیں ورنہ سُلگانے کہاں جاتے
بہار آئے بغیر ان پر شفا ہے بیخودی طاری
بہار آتی تو کیا معلوم مستانے کہاں جاتے

یہاں تک ذوقِ سجدہ ہم بنالیں کامراں اپنا
کہ اپنی ہی جبیں سے خود نکھاریں آستاں اپنا

بڑھے جاتے ہیں کون آگے مری ہستی کی منزل سے
قدم کچھ اور کردے تیز اے عمرِ رواں اپنا

کچھ ایسی بے حسی لیکر قفس سے آئے گلشن میں
کہ مشکل ہوگیا پہچاننا بھی آشیاں اپنا

کوئی کہدے کہ "منزل پر لگائے بعد میں ہم کو"
پتہ خود تو لگالے پہلے میرِ کارواں اپنا

بھٹکتے پھر رہے ہیں پھر تیوالے جو پئے منزل
یقیں کی راہ پر آجائیں لیکر وہ گماں اپنا

ہر اک شکوہ بجا، لیکن ذرا اتنا تو سمجھادو
نظر سے غیر کی کیوں دیکھتے ہو گلستاں اپنا

شفاؔ اپنے لئے یکساں ہے گلشن ہو کہ زنداں ہو
نہ کوئی حق یہاں اپنا نہ کچھ قابو وہاں اپنا

آئینۂ حسنِ حقیقت کا دکھائیں ہم تم
ایک ہی پردہ سے آؤ نظر آئیں ہم تم

زعمِ رفعت مہ و انجم کا مٹائیں ہم تم
آؤ سوئے ہوئے ذروں کو جگائیں ہم تم

ہو کے سرگرمِ عمل، بن کے مشیرِ فطرت
حُسنِ تدبیر سے تقدیر بنائیں ہم تم

اک نئی صبح کی آمد ہے باندازِ خرام
چشمِ مشتاق کی کرنوں کو بچھائیں ہم تم

ہم میں تم میں نظر آئے نہ دوئی کی صورت
ایسا اک آئینہ مل جُل کے بتائیں ہم تم

کس طرح جیتے ہیں، جب جینے پر آجاتے ہیں
مرنے والوں کو ذرا جی کے بتائیں ہم تم

جھوم کر گردشِ ہستی کی بھی رُک جائیں قدم
سازِ احساس پہ وہ گیت سُنائیں ہم تم

ماورائے نظر و دل، حدِ ادراک سے دور
اک نئی راہ محبت کی بنائیں ہم تم

ٹوٹتی آرزوؤں، ڈوبتے تاروں سے شفا
صبح کی چھاؤں میں اک بزم سجائیں ہم تم

نہ جانے کتنی وسعت ہے ابھی امکانِ وسعت میں
ضرورت اور بڑھتی جارہی ہے ہر ضرورت میں

نظر آتے ہیں مجھ کو زندگی کے راستے روشن
میں جب بھی زندگی پر تبصرہ کرتا ہوں فرصت میں

سہارا بیخودی کا کیا، جنوں کا آسرا لیتا
روا ہی کب ہے دخلِ ماسوا اصلِ محبّت میں

ابھی تو اشک بھر آتے ہیں ان کی یاد آتے ہی
بہت ترمیم ہونا ہے ابھی آدابِ الفت میں

شفا جی بھی نہیں سکتا ہوں اور مر بھی نہیں سکتا
نہ یہ ممکن محبّت میں، نہ وہ ممکن محبّت میں

وہ حجابِ دل میں میرے بے حجاب آیا تو کیا
انقلاب آئینہ دارِ انقلاب آیا تو کیا

میری ہی غمدیدہ آنکھیں مجھ کو کر تیں مطمئن
اُن کے لب پر میرے اشکوں کا جواب آیا تو کیا

داغِ ناکامی تو اب بھی ہے جبیں سے منفعل
لاکھ اُن کے آستاں سے کامیاب آیا تو کیا

خلقتاً جب زندگی ہے محشرِ صد انقلاب
پھر ہماری راہ میں یہ انقلاب آیا تو کیا

ہر نفس بھرتا تر ا پیمانۂ آبِ حیات
بحرِ ہستی میں بہ رفتارِ حباب آیا تو کیا

لُٹ چکی شب، بجھ چکے دل، مٹ چکے سوز و گداز
اب ستارہ صبح کا لیکر رباب آیا تو کیا

او توجہ کرنے والے شکریہ، جب مٹ چکا
اب خیالِ پرسشِ خانہ خراب آیا تو کیا

زندگی کی دھڑکنیں بن کر سماتا وہ **شفا**
صرف آنکھوں تک بہ رنگِ اضطراب آیا تو کیا

گلشن بدوش نظریں، لب پر حسیں ترانہ — ہر اک ادا ہی اُن کی الفت کا اک فسانہ
دیوانہ ساز گیسو، انداز والہانہ — ایمان لوٹتا ہے یہ رنگِ کافرانہ
مہکے ہوئے لبوں پر، ہلکا سا یہ تبسم — پھولوں سے ڈھل رہا ہو جیسے شرابخانہ
اب تک نگاہ میں ہے پہلی نگاہ اُن کی — ہنستی رہی محبت لٹتا رہا زمانہ
تاروں کی بزم ہو وہ یا ہو گلوں کی محفل — ہر ایک انجمن ہے اُن کا ہی جلوہ خانہ
اُنکی نظر پناہیں خود دل میں لے رہی ہے — بجلی کے سائے میں ہے اب میرا آشیانہ
کیا ہو بیاں کسی سے تفسیرِ حسن و الفت — شعلوں کی اک کہانی، شبنم کا اک فسانہ
دنیائے رنگ و بو میں یہ انقلابِ رنگیں — پھولوں کی ہیں جبینیں، کانٹوں کا آستانہ

مجھ کو شفا مٹانا آساں نہیں ہے کوئی
دیکھوں، ذرا مقابل آئے مرے زمانہ

بہار آتے ہی دامان و گریباں جاگ اٹھتے ہیں
گلستاں کروٹیں لیتے ہیں زنداں جاگ اٹھتے ہیں

جنوں افروز جب گیسوئے جاناں جاگ اٹھتے ہیں
خرد کی گود میں خواب پریشاں جاگ اٹھتے ہیں

کبھی جب دل میں اٹھتی ہیں کسی کی یاد کی موجیں
تو خوابیدہ تمناؤں کے طوفاں جاگ اٹھتے ہیں

دمکتی ہیں کسی کے لب پہ جب کرنیں تبسم کی
فضائیں چونک جاتی ہیں گلستان جاگ اٹھتے ہیں

غمِ جاناں سے ڈھلتا ہے غمِ دوراں کا آئینہ
یہ وہ قالب ہے جس میں قلبِ انساں جاگ اٹھتے ہیں

کبھی انگڑائیاں لیتی ہیں جب وہ نغمگی نظریں
نجوم و ماہ کے سازِ غزلخواں جاگ اٹھتے ہیں

مری ہر سانس کی تو ارتقا کی لے ہی گاتی ہے
تری آہٹ سے نغماتِ رگِ جاں جاگ اٹھتے ہیں

کوئی غم ہو شفا فطرت کا اک انعام ہوتا ہے
کہ اس سے زندگی کے سارے امکاں جاگ اٹھتے ہیں

ہو جو شایانِ بشر ایسا جہاں ڈھونڈینگے ہم
یوں محبت کے زمین و آسماں ڈھونڈینگے ہم
پھر زمیں پر مسکرا اٹھیں کے انوارِ فلک
اپنے ہی اشکوں کی رو میں کہکشاں ڈھونڈینگے ہم
منتِ صیاد کی حاجت نہ ہو گی کچھ ہمیں
اب قفس کی تیلیوں میں آشیاں ڈھونڈینگے ہم
ہو چکے کہنہ بہت یہ قصۂ فرہاد و قیس
واقعاتِ نو میں زندہ داستاں ڈھونڈینگے ہم
اب نیاز و ناز کا بدلیں گے بوسیدہ نظام
خود جبیں کے تیوروں میں آستاں ڈھونڈینگے ہم
آسکے گی اشکِ شبنم پر نہ غنچوں کو ہنسی
گلستاں شایانِ شانِ گلستاں ڈھونڈینگے ہم
ہر نئی تخریب ہوتی ہے **شفا** تعمیر بھی
جا کے خاکِ آشیاں میں آشیاں ڈھونڈینگے ہم

کسی کا نام لیکر جب کبھی انگڑائی لی میں نے
گھڑی بھر کے لئے نبضِ دو عالم روک دی میں نے

نباہی دشمنوں سے بھی ہمیشہ دوستی میں نے
اندھیروں کی ضمیروں سے نچوڑی روشنی میں نے

چھپائی حسن سے بھی عشق کی آشفتگی میں نے
نظر جب اُنکی اُٹھی تو نظر خود پھیر لی میں نے

کئی سورج نکھارے ہیں، کئی صبحیں سنواری ہیں
نہ دیکھی صرف آئینہ سمجھ کر زندگی میں نے

فرشتے کیا پہنچ سکتے ہیں میری حق پرستی کو
بقدرِ آدمیت کی ہے قدرِ آدمی میں نے

شبِ غم اِک جھلک اُبھری تھی اُن شگوفے تبسم کی
تو وہ بھی صبح کی پہلی کرن کو سونپ دی میں نے

غمِ جاناں کے خاکوں میں غمِ دوراں سمویا ہے
حیاتِ عارضی کو یوں بنایا دائمی میں نے

کبھی میں دار سے الجھا، کبھی میں آگ میں کودا
کئے طے اسطرح پست و فرازِ زندگی میں نے

بہت سانسوں کو روکا ہے بہت آہوں کو گھونٹا ہے
شفا مر مر کے سمجھا ہے مقامِ زندگی میں نے

بات جب ہے شاہکارِ زندگی بنکر رہے
آدمی جوہر شناسِ آدمی بن کر رہے

چاند سورج کا نہ انساں ملتجی بن کر رہے
اپنی راہوں میں خود اپنی روشنی بن کر رہے

کاش مرنا ہی پڑے تو موت کی منزل میں بھی
زندگی کے سلسلے کی اک کڑی بن کر رہے

ایک ایسا وقت بھی آیا نظامِ نو کے ساتھ
ہم خود اپنی ہی نظر میں اجنبی بن کر رہے

تنگ آکر وقت نے اعلان یہ کر ہی دیا
جس کو رہنا ہو یہاں وہ آدمی بن کر رہے

کتنے رخ بدلے گئے تاریخِ عالم کے مگر
ہم بہ ہر عنوان حرفِ آخری بن کر رہے

جذبۂ ایثار نکلا ارتقائے زندگی
راہِ غم میں مٹنے والے واقعی بن کر رہے

کیوں نہ ہر اک شاخ سے پھوٹے بغاوت کا لہو
گل کا جذبہ تا کجا آخر کلی بن کر رہے

ہر الم ہوتا ہے آئینہ مسرت کا شفاؔ
اشکِ شبنم پھول کے لب پر ہنسی بن کر رہے

غبار بن کے مہ و کہکشاں گزرتے ہیں
سنا ہے یوں بھی کہیں کارواں گزرتے ہیں

یہ مانا مرحلہ سخت ہے رہِ ہستی
گزرنے والے مگر بے تکاں گزرتے ہیں

وہ کیا کرینگے بھلا التفاتِ ارزانی
ہمارے سائے بھی جن پر گراں گزرتے ہیں

نکھاریں شوق سے پستی کے آئینوں میں عروج
زمیں کے بھیس میں کیسے آسماں گزرتے ہیں

عجب ہے فطرتِ انسانیت کے انساں کو
یقیں کی حد میں بھی لاکھوں گماں گزرتے ہیں

وفا کی راہ میں ایسی بھی ایک منزل ہے
جہاں سے رک کے ذرا دو جہاں گزرتے ہیں

جو انکی یاد سے خالی ہوں انکے ذکر سے دور
حیات پر وہی لمحے گراں گزرتے ہیں

دعائیں میں ستمِ دشمناں کو دیتا ہوں
نظر سے جب کرمِ دوستاں گزرتے ہیں

شفا سمو تو لیں ہم ان کو دھڑکنوں میں مگر
وہ دل کی راہگذر سے کہاں گزرتے ہیں

دار سے ہم دلِ بیدار تک آ پہنچے ہیں　　زندگی کے نئے معیار تک آ پہنچے ہیں
خوش بیاں تلخیٔ گفتار تک آ پہنچے ہیں　　سینۂ گل سے لبِ خار تک آ پہنچے ہیں
ہر قدم جلتے ہیں جب خود ہی چراغِ منزل　　لوگ اُس گرمیٔ رفتار تک آ پہنچے ہیں
اہلِ دل آج ہوئے عظمتِ دل کے قائل　　بے جھجک انجمنِ یار تک آ پہنچے ہیں
کیوں سبکسر ہوئے جاتے ہیں نظر میں اپنی　　کس کے احسانِ گہر انبار تک آ پہنچے ہیں
سوزِ دل بجلیاں بن جاتا ہے جس میں ڈھل کر　　سازِ انفاس کے اُس تار تک آ پہنچے ہیں
غمِ جاناں غمِ دوراں سے بدل جائے جہاں　　ہم اُس آئینۂ کردار تک آ پہنچے ہیں
خیر مقدم کے فریبوں کو سمجھنے کے لئے　　آج اک بزمِ ریاکار تک آ پہنچے ہیں
خود جہاں دار و رسن کرتی ہیں تعظیمِ حیات　　ہم اسی رفعتِ ایثار تک آ پہنچے ہیں

کیوں نہ بھڑکاؤں شفاؔ عزم کے شعلے بڑھ کر
مرحلے اب مرے اشعار تک آ پہنچے ہیں

تا کجا ماضی کو روئیں، تا بکے ماتم کریں
کیوں نہ فکرِ نو سے پیدا اک نیا عالم کریں

اک ذرا سے موڑ میں دنیا بدل جائے ابھی
موت کا غم کرنیوالے زندگی کا غم کریں

کس لئے دانستہ ہم کھائیں فریبِ حسن و عشق
کیوں غلط تائیدِ ربطِ شعلۂ و شبنم کریں

ظلمتیں گھٹنے کا آخر اور کب تک انتظار
لاؤ باقی رات کو بڑھ کر سحر میں ضم کریں

جو برا کہتے ہیں عالم کو انھیں یہ چاہیئے
پہلے اپنے آپ کو شائستۂ عالم کریں

بے جھجک بڑھتے رہیں گے ہم تو منزل کی طرف
جن میں خود ہو پیچ و خم وہ خوفِ پیچ و خم کریں

اے شفاؔ وہ کس طرح ہوں کامیابِ زندگی
ذکر جو زائد سے زائد، فکر کم سے کم کریں

فریبِ رنگیں ٹیگا، ہر شے حقیقتوں سے بھری ملیگی
ملینگے آنسو نہ اب ہنسی میں، نہ آنسوؤں میں ہنسی ملیگی

نہ ظلمتیں ہونگی کارفرما نہ اب کہیں گمرہی ملے گی
نظر نظر روشنی ملیگی، قدم قدم زندگی ملے گی

ہم اک نئی راہ کے ہیں رہرو، ہماری منزل کا پوچھنا کیا
ہمارے مسلک میں بیخودی بھی، باحتیاطِ خودی ملیگی

تجلیِ ماہ و گلستاں بھی نہ دے سکیگی فریبِ رنگیں
نگاہِ منزل طلب کو ہر سو اب اپنی ہی روشنی ملے گی

زمانہ خود محتسب بنے گا کچھ ایسے آئین بن رہے ہیں
جو زندگی کو سمجھ سکیگا اُسی کو اب زندگی ملے گی

سُبکسری منصبِ جنوں پر نہ لاسکیگی سُبکسروں کو
جو دار سے نشرِ حق کرے گا، اُسی کو دیوانگی ملے گی

شفاؔ کچھ ایسے مقام بھی ہیں ہماری ہستی کی منزلوں میں
جہاں قضا زندگی کے قدموں پہ خود سسکتی ہوئی ملے گی

ہم جنوں کو زندگی کا مستقر سمجھا کئے
اے شفا منزل کدھر تھی اور کدھر سمجھا کئے

وائے یہ کوتاہیِ احساس و تنگیٔ نظر
زندگی کو زندگی بھر مختصر سمجھا کئے

کارواں پہنچے قریب سعیٔ انجام سفر
اور ہم مفہوم آغازِ سفر سمجھا کئے

بیخودی نے کس قدر گمراہ رکھا عشق کو
ہم تصور ہی کو حسنِ معتبر سمجھا کئے

دیکھ کر بھی اُن کو ہم مایوسِ نظارہ رہے
ہر نظر کو لغزشِ ذوقِ نظر سمجھا کئے

حسن کے رنگیں معمّے عشق کے غمگین راز
کچھ سمجھ میں تو نہ آتے تھے مگر سمجھا کئے

ذرے ذرے کا شعور و ذہن کو عرفان تھا
بے خبر تھے خود، جو ہمکو بیخبر سمجھا کئے

آجتک ہم نے فروغِ دل پہ نظریں ہی کیں
مہر و مہ پر منحصر اپنی سحر سمجھا کئے

درحقیقت وہ ہلاکت آفریں نکلی شفا
ہم جسے اب تک محبت کی نظر سمجھا کئے

دید کے امکان حسنِ ارتقا پانے لگے
وہ نظر کی حد سے باہر بھی نظر آنے لگے

دیکھ کر ذروں کو تارے رقص فرمانے لگے
آسماں والے زمیں والوں کا گُن گانے لگے

ہے اسی کا نام دل کا سوز۔ معراجِ حیات
آدمی کو جب خوشی میں غم نظر آنے لگے

سوچکر انجامِ گُل غنچوں کی آنکھیں کُھل گئیں
دیکھ کر شبنم کے آئینوں کو تھرّانے لگے

فطرتاً اب جاگ اُٹھی ہے منزلِ ذہن و شعور
کارواں بھٹکے ہوئے خود راہ پر آنے لگے

گلستاں نے پالیا رازِ جمالِ جاوداں
لاکھ آئے اب خزاں کیوں پھول مُرجھانے لگے

کس قدر خطرے میں ہیں ہوش و خرد کی عصمتیں
اب تو دیوانے بھی فرزانوں کو سمجھانے لگے

میں تو کچھ سمجھا نہیں یہ استعارہ اے شفا
میری آتے ہی وہ اُٹھ کر بزم سے جانے لگے

احساسِ برتری کو کہاں گُدگدا سکے
خود اپنے حال پر بھی نہ ہم مسکرا سکے
کب اختیار، جبر کو دیکھیں مٹا سکے
کب بجلیوں کے سائے میں گُل مسکرا سکے
آزادیٔ بہار تو اس وقت جانیے
صحنِ چمن میں خار بھی جب مسکرا سکے
اُس کو ہی مسکرانے کا حق ہے حقیقتاً
آنکھوں میں جس کی اشک ہوں اور مسکرا سکے
ہیں وجہِ انفعال خود اپنی سیاہیاں
یوں ورنہ شامِ غم پہ سحر مسکرا سکے
مجھ کو دکھا دے کھوئے ہوئے میرے راستے
اس طرح کاش کوئی شفاؔ مسکرا سکے

بڑھے گمگشتگی آسودگی ایسی بھی ہوتی ہے
نظر رہ جائے کھو کر روشنی ایسی بھی ہوتی ہے

جو منزل بخش دے وارفتگی ایسی بھی ہوتی ہے
خودی کو جگمگا دے بیخودی ایسی بھی ہوتی ہے

جو کر دیتی ہے ساری عمر کی تاریخ کو روشن
حیاتِ مختصر میں اک گھڑی ایسی بھی ہوتی ہے

ہنسی میں اشک، اشکوں میں ہنسی دیکھی تو ہم سمجھے
الم ایسا بھی ہوتا ہے، خوشی ایسی بھی ہوتی ہے

پناہیں مانگتی ہے دشمنی کی مصلحت جس سے
خدا محفوظ رکھے دوستی ایسی بھی ہوتی ہے

ہماری مسکراہٹ میں اداسی دیکھنے والے
غموں سے جو سنورتی ہے خوشی ایسی بھی ہوتی ہے

خلا ہے پیٹ میں اور ہاتھ میں لبریز ساغر ہے
ہزاروں مفلسوں کی مفلسی ایسی بھی ہوتی ہے

نہ ہر اک سر پھرے پر مسکراؤ تم حقارت سے
خرد افروز ہو دیوانگی ایسی بھی ہوتی ہے

عزائم میں جوانی ہے، نہ قدموں میں روانی ہے
شفا یہ کھیل کیا ہے، زندگی ایسی بھی ہوتی ہے؟

جلالِ کوہِ گراں بنیں گے، جمالِ موجِ رواں بنیں گے
جُھکا کے جنگ و جدل کا پرچم نشانِ امن و اماں بنیں گے

ہر اک قدم سے حیات ابھریگی منزلِ کامیاب لے کر
جہاں سے اک کارواں ٹیگا، وہیں سے سو کارواں بنیں گے

نہ صبح کے جھٹپٹے میں اب لٹ سکیگی عصمت کسی کلی کی
جو باغ سے باخبر ہوں، ایسے خرد نظر باغباں بنیں گے

حیات کی ندرتیں سلامت، شعور کی نزہتیں مبارک
خیال سے گلستاں بنیں گے، نگاہ سے آشیاں بنیں گے

نہ ہوگا اخراجِ غنچہ و گل، نہ احتمالِ خزاں رہے گا
نئی روش کے، نئے چلن کے، نئے نئے گلستاں بنیں گے

رہینگی کوتاہ ظرفیاں یہ، نہ یہ غلط بخشیاں رہیں گی
ہٹا کے ہر میکدہ سے ساقی کو، رند ہی پاسباں بنیں گے

عروج کی حد کو چوم لیں گے تڑپ کے اب پستیوں کی تہ سے
زمین کے یہ حقیر ذرے، جلالتِ آسماں بنیں گے

چمن ہزار اپنے رنگ بدلے زمانہ کتنی ہی کروٹیں لے
شفاؔ بالآخر جہاں میں ہم ہی بہارِ روئے جہاں بنیں گے

اگر غم کی ہوئی یوں کارفرمائی تو کیا ہو گا
رہی ہوتے ہوئے بھی انکی تنہائی تو کیا ہو گا

جنوں کو راستے میں گر خرد آئی تو کیا ہو گا
نظر میری ہی میرے دل سے ٹکرائی تو کیا ہو گا

خوشی غم کی نزاکت کو نہ راس آئی تو کیا ہو گا
تری آغوش میں بھی روح گھبرائی تو کیا ہو گا

مبارک ہوں تبسم کو ترے یہ کروٹیں لیکن
مرے اشکوں نے لے لی کوئی انگڑائی تو کیا ہو گا

نگاہِ مضطرب کو لاکھ ٹھہرا لیں تو کیا حاصل
تجلی خود نظر بنکر جو تھرائی تو کیا ہو گا

جھکا دیں ہم تو سر ساقی تری گلرنگ جاموں پر
بغاوت کی جو کوئی موج ابھر آئی تو کیا ہو گا

مسلّم ذوقِ آزادی بھی، آدابِ اسیری بھی
قفس تک اُڑ کے خاکِ آشیاں آئی تو کیا ہو گا

گلوں کی دھڑکنیں تو جذب کر لاؤں گا گلشن سے
کسی غنچہ کی لیکن آنکھ بھر آئی تو کیا ہو گا

بہ سعیٔ احتیاطِ ذوقِ نظارہ بھی محفل میں
شفا میری نظر سب کو نظر آئی تو کیا ہو گا

جن سے گم ہو جائیں راہی کچھ نشاں ایسے بھی ہیں
زندگی کے راستے میں امتحاں ایسے بھی ہیں

برق سے سازش ہی جنکی، باغباں سے ساز باز
ہیں تباہی کا سبب خود آشیاں ایسے بھی ہیں

جو جبینوں میں جلا دیتے ہیں منزل کے چراغ
اس نمائش گاہ میں کچھ آستاں ایسے بھی ہیں

ظلم میں جن کے کرم ہے، لطف میں جن کے ستم
مہرباں ایسے بھی ہیں، نامہرباں ایسے بھی ہیں

جن کی فطرت خود خزاں پرور ہی، تخریب آفریں
اس جہانِ رنگ و بو میں گلستاں ایسے بھی ہیں

اعتبارِ راہبر ہے، اور نہ خود پر اعتماد
جو کہیں کے بھی نہیں ہیں کارواں ایسے بھی ہیں

جو زباں کو کر رہے ہیں بے شعوری سے تباہ
بدنصیبی سے شفا اہلِ زباں ایسے بھی ہیں

نہ عبادات سے ہے اور نہ ریاضات سے ہے
زیست کا آج بھرم زیست کے جذبات سے ہے

تو نے حالات کو مجبور کیا ہے خود ہی
کون کہتا ہے کہ مجبور تو حالات سے ہے

سرخیاں حق کی نظر آئیں تو آئیں کیوں کر
زندگی تیری عبارت تو روایات سے ہے

چھوڑ کر حضرتِ واعظ مجھے جاتے ہیں کہاں
آپ کی ذات تو وابستہ مری ذات سے ہے

نظر و فکر کی کاوش سے تجھے کیوں ہے گریز
زندگی، زندگی تیری انہیں لمحات سے ہے

اُس کی نظروں پہ چڑھائیگی افق پہلی کرن
چشم بر راہ سحر کے لئے جو رات سے ہے

بات میں بات نکل آئی تو سن لے یہ شفاؔ
آج بگڑی ہوئی ہر بات تری بات سے ہے

آدمی کو آہ نفرت آدمی سے ۔۔۔ روشنی کیوں ہے گریزاں روشنی سے
کچھ خودی سی اور نہ مطلب بیخودی سے ۔۔۔ ہے براہِ راست نسبت زندگی سے
تا کجا لیگی سہارا موت کا یہ ۔۔۔ زندگی کب تک بچیگی زندگی سے
رہروِ راہِ طلب تو کیوں ہی غمگیں ۔۔۔ رہبری ملتی ہے اکثر گمرہی سے
عارضی ہے سب یہ رنگینیٔ جلوہ ۔۔۔ آ رہی ہیں یہ صدائیں ہر کلی سے
صرف رسماً ہی یہ سانسیں چل رہی ہیں ۔۔۔ آج ورنہ جی رہا ہے کون جی سے
یہ بجا ہے چار دن کی چاندنی ہے ۔۔۔ کچھ لیا بھی چار دن کی چاندنی سے
اپنے ہاتھوں خود مصیبت مول لی ہے ۔۔۔ کیا شکایت اور کیا شکوہ کسی سے
صرف عذرِ لنگ کا مارا ہوا ہے ۔۔۔ ورنہ کیا ممکن نہیں ہے آدمی سے
او زمانے کی برائی کرنیوالے ۔۔۔ خود کو بھی پرکھا نگاہِ منصفی سے
کھول آنکھیں محوِ خوابِ خود فریبی ۔۔۔ دور ہے کوسوں ابھی تو آگہی سے

بحر کوئی سی ہو پانی کر دکھائیں
ہم شفاؔ واقف ہیں فنِ شاعری سے

ہمارے ذوق پر یہ وقت اگر آیا تو کیا ہوگا
نظر میں جذب ہو کر وہ نظر آیا تو کیا ہوگا
غمِ ہستی کا تارا اوج پر آیا تو کیا ہوگا
ہنسی میں بھی کوئی آنسو اُبھر آیا تو کیا ہوگا

اُدھر تارے، اِدھر کلیاں ہیں مصروفِ گراں خوابی
اگر ایسے میں پیغامِ سحر آیا تو کیا ہوگا
یہ خالی جام رکھیں گے بھرم کب تک ترا ساقی
جو میخانے میں کوئی دیدہ ور آیا تو کیا ہوگا

تمہارا غم، غمِ عالم کی سُرخی بن تو سکتا ہے
کوئی دھبہ اگر تاریخ پر آیا تو کیا ہوگا
چلے تو ہیں تلاشِ آستاں میں اے شفاؔ ہم بھی
مگر اپنا ہی پہلے سنگِ در آیا تو کیا ہوگا

جب تڑپ میں کمی ہو گئی ہے
مضمحل زندگی ہو گئی ہے

جس جگہ بھی قدم رکھ دیا ہے
اپنی منزل وہی ہو گئی ہے

جب اُٹھی ہے چمک کوئی دل میں
دور تک روشنی ہو گئی ہے

اے غمِ معتبر تیرے دم سے
زندگی کام کی ہو گئی ہے

عالمِ رنج و حرماں نہ پوچھو
ہر خوشی خواب سی ہو گئی ہے

یوں بھی محسوس اکثر ہوا ہے
جیسے دنیا مری ہو گئی ہے

اے شفا نظمِ نو کی بدولت
عزتِ آدمی ہو گئی ہے

توڑ کر ہم بیخودی کی حد خودی تک آ گئے
موت سے کر کے بغاوت زندگی تک آ گئے

اپنی منزل آپ ہی خود آ رہے ہیں اب نظر
ہو نہ ہو ہم آج اپنی روشنی تک آ گئے

اے غمِ عالم تری اس دلنوازی کے نثار
تیرے نزدیک آکے جیسے ہر خوشی تک آ گئے

کیوں فضاؤں میں نظر آتی ہیں جلووں لے غبار
کیا مہ و خورشید گردِ آدمی تک آ گئے

بجھ رہی ہیں جن کی خاطر عشرتیں کونین کی
ایسے غم بھی کچھ ہماری زندگی تک آ گئے

اب محبت کا ہر اک رُخ آئینہ بن جائے گا
آج ہم اُنکی نگاہِ بے رُخی تک آ گئے

فطرتاً اب ہو چلا انسان فطرت آشنا
خود گماں سارے یقیں کی روشنی تک آ گئے

شاعری کی راہ میں کرتے ہوئے روشن چراغ
اے شفا ہم بھی مقامِ زندگی تک آ گئے

یوں بھی وہ بارہا نظر آئے
جیسے قوسِ قزح نکھر آئے

راہ میں لاکھوں سنگِ در آئے
ہم بچا کر نگہہ گذر آئے

زیست کی ہم ہر ایک منزل پر
بے تحاشا و بے جگر آئے

ان کی محفل لاکھ اٹھائے گئے
مگر ہم اپنا کام کر آئے

یہ بھی احسانِ رہبری ہوگا
قافلے میں نہ راہبر آئے

زندگی اب وہ زندگی نہ رہی
موت آئے تو سوچکر آئے

اے شفا اپنی رات ہی اچھی
سحر آئے تو معتبر آئے

لبوں پہ انکی حیات آفریں ہنسی نہ رہی — گلوں میں بوئے، ستاروں میں روشنی نہ رہی

خدا شناسوں کی پہچان ہی کوئی نہ رہی — کہ سرکشی بھی باندازِ سرکشی نہ رہی

فسانہ گردشِ دوراں کا نظم کر لیتے — مگر نگاہ میں ان کی وہ برہمی نہ رہی

وقارِ ذوقِ تجسس پہ حرف آئیگا — اگر شریکِ سفر اپنے گمرہی نہ رہی

ہے اپنا سوزِ تبسم شریکِ سازِ چمن — اسیرِ گریۂ شبنم کوئی کلی نہ رہی

رہے نگاہ میں آدابِ لغزشِ الفت — خودی سے دیکھے کبھی اپنی بیخودی نہ رہی

ملا تھا موقعِ تکمیلِ داستانِ حیات — جبینِ گل پہ شکن اور کھیلتی نہ رہی

شبِ فراق کچھ ایسے بھی حادثے گزرے — چراغ جلتے رہے اور روشنی نہ رہی

بنائے ہم نے شفا دوستی کے وہ سانچے
کہ دشمنوں کو تمنائے دشمنی نہ رہے

کوئی غم نہ کوئی خوشی چاہتے ہیں
ہو بے لوث وہ زندگی چاہتے ہیں
نہیں چاہتے عارضی کوئی جلوہ
جو غم سے ڈھلے وہ خوشی چاہتے ہیں

جو یکسر جواں ہو مُسلسل رواں ہو
ہم اس شان کی زندگی چاہتے ہیں
ہنسائے، رُلائے، بنائے، بگاڑے
بہ ہر حال غم کی خوشی چاہتے ہیں

ابھی ہم تباہی پہ نازاں نہیں ہیں
ذرا اور آشفتگی چاہتے ہیں
سحر لے کے آئے، کہ شب دیکھے جائے
غرض اِک نئی روشنی چاہتے ہیں

جو انسانیت کی جبیں جگمگا دے
ہم ایسی شفاؔ شاعری چاہتے ہیں

زمیں پر فلک کے نظارے ملیں گے
نگاہوں میں ذروں کی تارے ملیں گے

اُفق میں، شفق میں، بہار و خزاں میں
تمہاری نظر کے اشارے ملیں گے

اک ایسا حسیں وقت بھی آرہا ہے
کہ شبنم سے جاکر شرارے ملیں گے

جہاں زندگی کو شکستوں کا ڈر ہے
وہیں زندگی کو سہارے ملیں گے

مبارک ہو وہ موڑ پاس آگیا ہے
جہاں آکر انسان سارے ملیں گے

فریبِ نظر کھانیوالوں سے کہدو
کناروں سے ہٹ کر کنارے ملیں گے

شفاؔ آج کے دورِ آشوب میں بھی
ہزاروں محبت کے مارے ملیں گے

بن کر حیات چھائیں گے سارے جہان پر
دیوانے کھیل جائیں گے جب اپنی جان پر

لاؤ زمین ہی کو بنالیں نہ آسماں
لیگی بھی کیا پہنچ کے زمین آسمان پر

اوروں کے نقش پر نہ چلو رہروانِ شوق
منزل ملیگی چل کے خود اپنے نشان پر

ہر اصطلاحِ حسن سے واقف ہوں میں حضور
کیوں رو رہے ہیں آپ مری داستان پر؟!

دار و رسن تو گردِ گزرگاہ بن چکے
نظریں لگی ہوئی ہیں نئے امتحان پر

اِک دن نکھارتا ہے یہی جلوۂ یقیں
فرمایئے نہ طنز کسی بدگمان پر

منصور تیرے بعد نہ اُبھریں حقیقتیں
پھر دل کی بات کوئی نہ لایا زبان پر

پروازِ ارتقا کی یہ توہین ہے شفا
کیوں رُک کے رہ گئی ہے نظر آسمان پر

توجہ اُن کی جب کم ہو گئی ہے
محبت اور محکم ہو گئی ہے
الم میں ہر خوشی ضم ہو گئی ہے
عجب تصویرِ عالم ہو گئی ہے

مبارک تم کو اے ذرو، زمیں پر
جبینِ آسماں خم ہو گئی ہے
ذرا دیکھو تو اے نکتہ شناسو
یہ کیا رفتارِ عالم ہو گئی ہے

سرِ محفل یہ کس کے اشک اُبھرے
یکایک شمع مدھم ہو گئی ہے
حقیقت تو یہ ہے روزِ ازل سے
بغاوت جزوِ آدم ہو گئی ہے

شفاؔ بس ختم کر روداد اپنی
کہ اُن کی آنکھ پُرنم ہو گئی ہے

ہمراہ مسکرا کے مہ و کہکشاں چلے
دیوانگانِ صبح کے جب کارواں چلے

ذرّوں میں انقلاب کی شورش نہیں رہی
ورنہ زمیں کی چھاتی پہ یوں آسماں چلے

اے میری آنسوؤ، مری آنکھوں کی زندگی
تم بیکسی میں چھوڑ کے مجھ کو کہاں چلے

منزل پہ جانیوالو بس اتنا رہے خیال
رہبر سے دُور دور ذرا کارواں چلے

ہر راہ پر تو آپ جمائے ہوئے ہیں پاؤں
اب کوئی چلنے والا چلے تو کہاں چلے

اے باغبانِ تنگ نظر دیکھ تو ذرا
گلشن سے رفتہ رفتہ سبھی آشیاں چلے

خود ہی تو مجھ کو بزم سے اُٹھنے کو کہدیا
پھر خود ہی پوچھتے ہیں "شفا" تم کہاں چلے

یوں کسی کی نظر سے نظر مل گئی
جیسے کھوئی ہوئی رہگذر مل گئی

قیمتِ ذوقِ سعیٔ سفر مل گئی
اے شفاؔ منزل معتبر مل گئی

ایک احساس افروز انگڑائی ہیں
ساری دنیا بحدِ نظر مل گئی

اعتمادِ سفر سے جب اٹھے قدم
راہبر مل گیا، رہگذر مل گئی

ساری خودداریاں دل کی رکھی رہیں
ان کے جلووں میں جا کر نظر مل گئی

پھروں اپنا لہو آپ پیتی رہی
پھول سے جب کلی کی نظر مل گئی

ذکرِ جاناں بھی ہوگا یقیناً شفاؔ
فکرِ دوراں سے فرصت اگر مل گئی

بغاوت کی دلِ گلشن سے جب پھوٹینگی تنویریں
گلوں کی پتیاں بھی ڈھل کے بن جائینگی شمشیریں

مکمل سختیٔ تنقید سے ہوتی ہیں تعمیریں
شعائیں مہر کی ورنہ کلی کا کیوں جگر چیریں

خلوصِ زندگی، سوزِ مسلسل، جذبۂ صادق
یہی دیوانگانِ شوق کی ہوتی ہیں جاگیریں

کسی صورت بھی تسکینِ نگاہ و دل نہیں ہوتی
نہ جانے کس طرح کھینچی ہیں آزادی کی تصویریں

بغیرِ سعیٔ پیہم ہر تمنا خود فریبی ہے
کہ تقدیروں کے آئینے ہوا کرتی ہیں تدبیریں

جہاں میں آنیوالا انقلاب آکے ہی رہتا ہے
نہ کام آتی ہیں تقریریں نہ راس آتی ہیں تحریریں

رہا ہونے پہ بھی کچھ اسطرح محسوس ہوتا ہے
کہ ہر موجِ نظر میں جیسے لہراتی ہوں زنجیریں

وہ مہر و مہ سے کب ممکن جو کر دیتا ہے اک غنچہ
دلِ انساں کی تشریحیں، غمِ دوراں کی تفسیریں

ابھر کر ہی رہیگی صبحِ منزل نقشِ نو لیکر
یقیناً مسکرائینگی شفاؔ خوابوں کی تعبیریں

رُباعیات

جوانی

ہوتی ہے پہاڑوں میں روانی زاہد
شعلوں سے امنڈ آتا ہے پانی زاہد
پھر کچھ بھی سہی، اک بار تو با جاہ و جلال
پھر پھر بھی آتی ہے جوانی زاہد

رقصِ جوانی

تاروں کی ہے رعنائی جوانی گویا
ہے غنچوں کی برنائی جوانی گویا
یہ رقص ہے آدم کا یہ حوا کا خرام
فطرت کی ہے انگڑائی جوانی گویا

تزئینِ حیات

کچھ غم کی پناہوں میں گزر جاتے ہیں
کچھ عجز کی راہوں میں گزر جاتے ہیں
ہوتے ہیں وہی باعثِ تزئینِ حیات
جو لمحے گناہوں میں گزر جاتے ہیں

احساسِ نظر

ہم ذوق کو محبوس نہ ہونے دیں گے
نظارے کو مایوس نہ ہونے دیں گے
یوں دیکھیں گے حُسن اُن کا، بجز احساس
نظروں کو بھی محسوس نہ ہونے دیں گے

حقیقت پوشی

جلووں میں بصارت کو چھپانے والے
آئینے میں صورت کو چھپانے والے
ایسا نہ ہو تو آپ ہی چھپ کر رہ جائے
ہشیار حقیقت کو چھپانے والے!!

میری فطرت

انسانیت افروز ہے طینت میری
حساس و ہمہ گیر ہے خلقت میری
ہر ایک کے غم سے میں تڑپ جاتا ہوں
آئینۂ سیماب ہے فطرت میری

انسان

فطرت کی نزاکت کو سمجھ لے پہلے
اس زندہ حقیقت کو سمجھ لے پہلے
انسان تجھے بننے کا دعویٰ ہے مگر
انسان کی عظمت کو سمجھ لے پہلے

مشورہ

دیوانوں کے منہ دیکھنا کھل جائینگے
سب چاک گریبانوں کے سل جائینگے
بندوں کو تو بندوں سے ملا دو زاہد
اللہ سے پھر آپ ہی مل جائینگے

تقدیر

ہر شام سے اک صبح نکل سکتی ہے
تصویر سے تصویر اُتر سکتی ہے
تقدیر کی اُلجھن میں اُلجھنے والے
تدبیر سے تقدیر سنور سکتی ہے

اعتدال

کیا سنتے ہو آوازۂ دُنیا دیکھو
کیا پاتے ہو خمیازۂ دُنیا دیکھو
اے دیکھنے والو بہ نگاہِ عبرت
دُنیا کو باندازۂ دُنیا دیکھو

جذبۂ پنہاں

کرنا ہے جو مجھ کو تو بیاں بھی کردے
ہاں جذبۂ پنہاں کو عیاں بھی کردے
اور زیست کے بیچ میں اٹھنے والے
اُٹھ زیست کے بیچ کو رواں بھی کردے

نظامِ دنیا

بگڑا ہوا ہر کام سنبھل جائیگا
طوفانِ الم سر سے نکل جائیگا
تم اپنے تو اطوار بدل لو پہلے
دنیا کا نظام آپ بدل جائیگا

جذبات

خدمات کو محدود نہ ہونے دیں گے
دن رات کو محدود نہ ہونے دیں گے
ہر رُخ سے بنائیں گے ادب کو روشن
جذبات کو محدود نہ ہونے دیں گے

تضادِ رفتار

مایوسی کے غاروں میں نہ مقصد سو جائے
تخریب نہ تعمیر میں شامل ہو جائے
اے کارواں والو یہ تضادِ رفتار
منزل کے غباروں میں نہ منزل کھو جائے

شاعر

زرپاروں میں محبوس نہیں ہو سکتا
جھنکاروں میں محبوس نہیں ہو سکتا
شاعر ہے غریبوں کے دلوں کا شعلہ
دیواروں میں محبوس نہیں ہو سکتا

تنگ نظر

کب حسن کا جوہر نظر آتا ہے انھیں
تاریک ہر اختر نظر آتا ہے انھیں
پتھرائی ہوئی ہوتی ہیں آنکھیں جن کی
آئینہ بھی پتھر نظر آتا ہے انھیں

افلاس

غم اپنے ہی اندھیاروں میں کرتا ہے
ہر ذرہ زمین میں گڑا جاتا ہے
اس منزل عبرت پہ قدم ہیں کہ جہاں
مفلس سے خود افلاس بھی شرماتا ہے

معاشی بحران

افلاس کا ہر سمت اٹھا ہے طوفان
پیٹوں میں بھنور، دل میں بپا ہے ہیجان
انسان کو انسان نہ کھائے کب تک
ہے نقطۂ آخر یہ معاشی بحران

بغاوت کا راز

جبرِ غمِ ایام سے گھبراتے ہیں
طوفانِ مصائب سے بپھر جاتے ہیں
جب ہو جاتا ہے پانی سر سے اونچا
انسان بغاوت پہ اُتر آتے ہیں

اُردو دشمنوں سے

طوفان کو مٹھی میں چھپانے والو
باطل سے حقیقت کو دبانے والو
تنکوں سے رُکا کرتا ہے طوفان کہیں
"اُردو" نہیں مٹ سکتی مٹانے والو

تنگ نظرانِ اُردو سے

سمجھا ہی نہیں ذہنِ تہی سے بڑھ کر
سوچا نہ کبھی تنگ دلی سے بڑھ کر
اے "اردو" کو سوتیلی سمجھنے والو
ہے جرم تمھاری یہ تنگی سے بڑھ کر

اُردو کی بیداری

ہے زندہ و بیدار کہانی اس کی
طوفان بدوش ہے جوانی اس کی
حق اپنا یہ خود اُٹھی ہے منوانے کو
ممکن نہیں رک جائے روانی اس کی

اُردو کی فطرت

بجلی سے بھی کچھ تیز چمک ہے اس کی
شعلوں سے کہیں سوا بھڑک ہے اس کی
نادانو! دبانے سے یہ اور ابھرے گی
فطرت ہی میں کچھ ایسی لچک ہے اس کی

اُردو کی ہمہ گیری

جاری ہے ہر اک ملک میں سکہ اس کا
آفاقیت اردو ہے جلوہ اس کا
صرف ایک علاقے ہی پہ موقوف نہیں
ہے سارا جہاں آج علاقہ اس کا

اُردو والوں پہ بہتان

کس نے کہا اُردو رہے ہندی نہ رہے
اس دیس کے منچلے نہیں ہندی نہ رہے
کھائی ہے یہ خود قسم بجذباتِ جنوں
اُردو سے ہیں یہ کوئی چڑی نہ رہے

اُردو کی جاودانی

اُردو ہماری زبانوں کی نمائندہ ہے
ہر بزم میں ہر رزم میں تابندہ ہے
اُردو کو حاصل ہے حیاتِ جاوید
گو پھانسی پہ لٹکی ہے مگر زندہ ہے

اُردو کا حق

ارماں یہی رکھتے ہیں بس اہلِ جہاں
ہر خطے میں اُردو ہو علاقائی زباں
ہر ایک زباں سے ہے سوا حق اس کا
تفصیل جو پوچھو تو عیاں را چہ بیاں

اُردو کا کرشمہ

باطل ہے حقیقت کی اماں میں کیا خوب
جل کر بھی تو ہے تیر کماں میں کیا خوب
اُردو کو نکلنے کا دیا ہے جو حکم
وہ حکم ہے خود اُردو زباں میں کیا خوب

لسانی فرقہ داری

آتا نہیں انداز عداوت ہم کو
کوتاہ خیالی سے ہے نفرت ہم کو
سمجھو تم کو عجیب ہے کہ بغیر تفریق
ہے ساری زبانوں سے محبت ہم کو

بہتان طرازی

ہندی کی کبھی کر نہیں سکتے تحقیر
تہذیب و تمدن کی ہے یہ بھی تصویر
یہ کس طرح چاہیں گے کہ ہندی مٹ جائے
لاریب کہ ہم اتنے نہیں کور ضمیر

لسانی اتحاد

مشرق کے ممالک کا ہو کچھ بھی مخلوط
ہوں ذہن و شعور و نگہ و دل مربوط
ہر ایک زباں سے ہے محبت ہم کو
ہوتے ہیں زبانوں ہی سے رشتے مضبوط

اردو کا مذہب

ہر ذہن پہ ہے اردو کی لطف ارزانی
ہر ایک زباں پہ ہے جمال افشانی
اول تو نہیں ہے کوئی مذہب اس کا
بالفرض اگر ہے بھی تو ہندوستانی

صالح تقیب

ساحل سے لگاتی ہے سفینہ تقیب
ہر نقش کو کرتی ہے نگینہ تقیب
اے رہبر معراج زبان ان نثر
تعمیر و ترقی کا ہے زینہ تقیب

فیض حیات

ادوار میں بھڑک اُٹھے چراغ نغمات
رفتار میں شامل ہوئے زندہ جذبات
رقصاں ہے رگ ادب میں خون تازہ
اب رک نہیں سکتی ہے اشفا "فیض حیات"

شکریہ

چمپارن علاقہ بہار کے نوجوان اور ہونہار شاعر
نظیر احمد راشد نے "نبض حیات" کی اشاعت کے
سلسلے میں جس مخلصانہ توجہ سے کام لیا ہے اس سے
میں بہت متاثر ہوں اور ان کا تہ دل سے شکریہ
ادا کرتا ہوں۔

۱۵ ر اگست ۵۵ء

(باہتمام عتیق اللہ خان خفی۔ بھوپال پریس بھوپال میں طبع ہوئی)

7 1.5